نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ر تاریخ تک شایع ہوتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ر تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے۔ ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا

سالانہ قیمت پانچروپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ عہ

بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۶	فہرست مضامین اکتوبر ۱۹۳۴ء	شمارہ ۴

ملاحظات ــــــــــــــــــــــــ ۲

عہد وسطیٰ کے فنون لطیفہ اور اسلام ــــــــــــــ ۹

تمہارا مسلک اور میرا مسلک ــــــــــــــ ۲۰

نغمۂ دل ـــــ مرزا احسان احمد بی اے، ال ال بی ـــــ ۲۳

استدراک جناب دل شاہجہانپوری ـــــ حکیم ضمیر حسن خاں دل شاہجہانپوری ـــــ ۲۶

موجودہ ترقی فقط ایک دھوکا ہے ـــــ محمد عثمان ام۔ اے۔ بی ال۔ وکیل ہزاری باغ ـــــ ۳۴

تراب شاہ ـــــ طالب صفوی ـــــ ۴۲

مکتوبات نیاز ــــــــــــــ ۴۹

باب المراسلۃ والمناظرۃ ــــــــــــــ ۵۵

باب الاستفسار ــــــــــــــ ۶۶

منظومات ـــــ عدم، روش، اختر، یحییٰ، فطرت، شمیم ـــــ ۷۰

نگار

اڈیٹر :- نیاز فتحپوری

شمارہ ۴	اکتوبر سنہ ۱۹۳۴ء	جلد ۲۶

ملاحظات

عورت — تعلیم — پردہ

گزشتہ ماہ کے ملاحظات میں ہم نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ ظاہر کیا تھا کہ مغربی تعلیم کا اثر ہندوستان کی عورت اور خصوصیت کے ساتھ مسلمان عورت پر کتنا خراب پڑ رہا ہے، لیکن چونکہ بحث کچھ تشنہ رہ گئی تھی اس لئے آج کی صحبت میں ہم اس کو مکمل کر دینا چاہتے ہیں۔

اس سے قبل ہم نے یہ ظاہر کیا تھا کہ جو نصاب تعلیم اور جو اسلوب تربیت نسوانی مدارس میں رائج ہے اس سے مغربی بیباکی و بے حجابی بلکہ زیادہ صاف الفاظ میں یوں کہنا چاہئے کہ بے حیائی و بے شرمی کی تکمیل تو ضرور ہو جاتی

ہے، لیکن آزادی کا وہ جذبہ جو خودداری و صیانتِ نفس کو مستلزم ہے پیدا نہیں ہوتا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ موجودہ طریقِ تعلیم کا سب سے بڑا نقص ایک اور یہ بھی ہے کہ وہ عورت میں بیجا خودنمائی اور ناروا زیبایش و آرائش کا احساس پیدا کرتا ہے اور اُس بلندیٔ اخلاق کی طرف مائل ہونے کی مہلت ہی نہیں دیتا جس کو اگر عورت سے علٰحدہ کر دیا جائے تو وہ اس خوش رنگ پھول سے زیادہ کچھ نہیں رہتی جو صبح کھلتا ہے اور شام تک مرجھا جاتا ہے۔

اس لئے اب بحث طلب امر یہ ہے کہ اگر عورت کو تعلیم دینا ضروری ہے تو وہ کس قسم کی ہونی چاہئے اور نیز یہ کہ کیا پردہ کی موجودہ پابندیاں دور کئے بغیر عورت کوئی ذہنی و دماغی ترقی کر سکتی ہے یا نہیں۔

ہر چند یہ دونوں مسئلے اس قدر پامال و فرسودہ ہیں کہ ان پر بحث کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا، لیکن چونکہ میری رائے ان مسایل میں ایک حد تک سب سے علٰحدہ ہے اس لئے اس کا ظاہر کرنا غالبًا فایدہ سے خالی نہ ہوگا۔

یوں تو اصولاً میں تعلیم کا موافق اور پردہ کا مخالف ہوں، لیکن موجودہ ترقی یافتہ نسل نے جو ترقی یافتہ نظریئے اس باب میں قایم کئے ہیں ان سے مجھے سخت اختلاف ہے۔ میرے نزدیک ایک عورت کی تعلیم کا یہ معیار کہ وہ انگریزی اچھی لکھ پڑھ سکتی ہے، غزل خوب کہتی ہے یا یہ کہ فسانے اور عشقیہ مضامین لکھنے میں مہارت تامہ رکھتی ہے، اتنا ہی غلط ہے جتنی پردہ کے باب میں یہ سختی کہ اس کو قدرت کی ان تمام نعمتوں سے محروم کر دیا جائے جن سے فائدہ اُٹھانا اسکا فطری حق ہے۔

عورت کے لئے تعلیم ضروری ہے لیکن صرف اس حد تک کہ وہ اپنے حقوق مردوں سے حاصل کر سکے اور مردوں کے حقوق ادا کرنے کی اہلیت اس میں پیدا ہو جائے۔ اس کی تعلیم و تربیت کا سنگِ بنیاد صرف یہ خیال ہونا چاہئے کہ اگر ملک و وطن کی خدمت کا تمامتر انحصار مردوں پر ہے تو وہ اُن مردوں کی ماں ہے اور اگر کوئی قوم ناکارہ افراد کی وجہ سے فنا ہو سکتی ہے تو بھی اس کی تمامتر ذمہ داری اس کی آغوش تربیت پر عاید ہوتی ہے۔ اُس کے حقوق مردوں پر یہ ہیں کہ وہ اپنے اخلاق بلند کرنے کے لئے اُن سے عزم و احترام کا مطالبہ کرے اور مردوں کے حقوق اس پر یہ ہیں کہ وہ اپنے بلند اخلاق سے کام لیکر انھیں ملک و قوم کی خدمت کا اہل بنائے۔ دنیا کا یہ نظریہ کہ عورت محبت کئے جانے کے قابل ہے نہایت خطرناک نظریہ ہے اور اسی نے عورت کو اس کے مرتبہ سے گرا دیا۔ صحیح نظریہ صرف یہ ہے کہ عورت عزت و احترام کی چیز ہے اور اگر اس سے محبت کی جا سکتی ہے تو صرف وہی جو احساسِ مجد و شرف کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔

مرد عورت کے باہمی تعلق کی بنیاد اگر محض محبت پر رکھی جائے تو یہ صرف جذبات کا کھیل ہوگا اور جذبات بھی وہ جو یکسر انفرادی تشخصات احساس سے وابستہ ہیں اور اجتماعیات سے انھیں کوئی واسطہ نہیں، پھر اول تو یہ جذبات بجائے خود ناپایدار چیز ہیں اور اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض کر لیا جائے کہ وہ ساری عمر کا ساتھ دینے والے ہیں تو بھی

اس سے عورت کا وہ احساسِ مغلوبیت دور نہیں ہو سکتا جو قدرتاً ایک مرد کے مقابلہ میں اس کی دلکشی و رعنائی کے انحطاط پذیر ہونے کے احساس سے پیدا ہونا چاہئے۔

سب سے بڑی اور اصولی غلطی یہی ہے کہ مرد عورت کا مطالعہ اس کی ظاہری ساخت سے شروع کرتا ہے اور اکثر و بیشتر اسی جگہ ختم کر دیتا ہے، درانحالیکہ خود اپنی طرف سے جو چیز پیش کرتا ہے وہ اس کا بطون ہے۔ یعنی اگر وہ کسی عورت کے حسن و جمال کی تعریف کرتا ہے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ اس کی عوض میں ایک محبت کرنے والا دل پیش کر رہا ہے۔ پھر ایک وقت عورت پر ایسا آتا ہے، جب وہ خود یا مرد کے طرزِ عمل سے مجبور ہو کر یہ سمجھنے پر مجبور ہوتی ہے کہ مرد نے واقعی یہ سودا نہایت گراں قیمت پر طے کیا تھا اور اس احساس کے ساتھ ہی قدرتاً اس میں پستی و مغلوبیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا اثر اس کی اولاد پر پڑنا ناگزیر ہے۔

برخلاف اس کے اگر مرد و عورت کے تعلق کی بنیاد یہی بجائے محبت کے عزتِ نفس و احترام اخلاق پر قائم ہو تو کبھی یہ عدم توازن پیدا نہیں ہو سکتا اور عورت بھی اس خیال کو سامنے رکھ کر اپنا سر بلند رکھ سکتی ہے کہ مرد نے جو چیز اس سے طلب کی وہ وہی تھی جو خود اس نے دی، یعنی اگر اُس نے اپنی مردانہ سیرت کے تمام برکات اس کے سامنے پیش کر دئے تھے تو عورت نے بھی اپنا حسن نہیں بلکہ اپنی نسائیت اس کے لئے وقف کر دی تھی جو مرد کی بڑی سی بڑی قربانی کی قیمت قرار دی جا سکتی ہے۔

پھر قبل اس کے کہ نسوانی مدارس کی تعلیم و تربیت پر توجہ کی جائے، ضرورت اس امر کی ہے کہ مرد خود اپنی تربیت میں وہ صلاحیت پیدا کرے جو عورت کو صحیح معنی میں عورت بنانے والی ہے اور اس کے دل سے یہ خیال دور کر دے کہ وہ کمزور ہے، کم عقل پیدا ہوئی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کسی گھر میں کئی بھائی بہن ہیں تو والدین اکثر و بیشتر لڑکوں کی طرفداری کرتے ہیں اور لڑکیوں کو اُن کے ہاتھ سے مار کھاتے ہوئے دیکھ کر بجائے برہم ہونے کے خوش ہوتے ہیں۔ لڑکا باہر سے آتا ہے اور اپنی بہن پر حکومت کرتا ہوا آتا ہے، وہ غریب اس خیال سے کہ اگر اس کے حکم کی تعمیل نہ کی تو وہ مار بیٹھے گا اور پھر کوئی اسکی فریاد سننے والا نہیں ہے، طوعاً و کرہاً چاکرانہ اسکی خدمت کے لئے طیار ہو جاتی ہے۔ والدین سمجھتے ہیں کہ اس طرح لڑکی کو گھر کا کام کرنے کی عادت ہوتی ہے، اور اس طرف خیال منتقل نہیں ہوتا کہ جس لڑکی میں ابتدا ہی سے مغلوبیت و مظلومیت کی یہ فتادگی پیدا کی جا رہی ہے وہ جوان ہو کر اپنے شوہر کے مقابلہ میں جذبۂ خودداری کیونکر قائم رکھ سکتی ہے اور اس سے کب یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی اولاد میں آزادی کا صحیح جذبہ پیدا کر سکے گی۔ ہندوستانی عورت کی زندگی کا تجزیہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ شروع سے آخر تک وہ رونے کڑھنے، خدمت کرنے اور دوسروں کی خاطر اپنے جذبات کا خون کرنے کے لئے

پیدا ہوئی ہے - جب تک اس کی شادی نہیں ہوتی اس کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ چاکرانہ طور پر بھائیوں کی خدمت کرے، گھر کا کام سنبھالے اور جب عقد کے بعد شوہر کے سپرد کی جاتی ہے تو اس حیثیت سے گویا وہ کنیز ہے، ادنی خادمہ ہے جسکا فرض سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ مرد کی خوشنودی کے لئے خواہ وہ کتنی ہی ناجایز کیوں نہ ہو اپنے جذبات و احساسات کا خون کرتی رہے --- یقیناً خدمت بُری چیز نہیں، گھر کا کام کرنا معیوب نہیں، شوہر کی اطاعت و فرمانبرداری ضروری ہے، لیکن مراعات و حُسنِ سلوک کے انداز سے، احساسِ خودداری و جذبۂ غیرت کے ساتھ ساتھ، یعنی اس خیال سے نہیں کہ وہ اسپر مجبور ہے بلکہ اس خیال سے کہ مرد اس باب میں اُس کا محتاج ہے - پھر غور کیجئے کہ آج کتنے خاندان ہیں جہاں عورت سے یہ مساویانہ سلوک روا رکھا جاتا ہے اور کتنے مرد ہیں جو عورت کے جذبات کا لحاظ کرکے اپنے اوپر کسی قسم کا جبر اختیار کرتے ہوں --- الغرض ہندوستان میں عورت کی ہستی کوئی ایسی چیز نہیں جو تکمیلِ تہذیب و معاشرت میں برابر کا حصہ لینے والی ہے، بلکہ اُسے بھی منجملہ دیگر اسباب و ذرایع کے ایک ذریعہ و سبب سمجھا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں اسکی اہمیت کیا قایم ہو سکتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ جدید تعلیم نے مغربی عورت کے اندر یہ احساس پیدا کر دیا ہے کہ وہ مرد کی محکوم رہنے کے لئے پیدا نہیں ہوئی، لیکن چونکہ وہ مرد کے مظالم کو زمانۂ نامعلوم سے برداشت کرتی چلی آرہی تھی اس لئے یہ احساس اسکے اندر ایک انتقامی جذبہ پیدا کر رہا ہے اور اب وہ بھی اسی جبر و استبداد سے کام لینا چاہتی ہے جسکی وہ شکار رہ چکی ہے - پھر ظاہر ہے کہ ہندوستان میں جہاں عورت کی داستانِ مظلومیت کہیں زیادہ قدیم و دردناک ہے، تعلیم کا اثر اسپر کیا ہو گا اور یہ ردِ عمل جو ناگوار صورت بھی اختیار کرے کم ہے --- اس لئے اب ہمارے سامنے یہ سوال نہیں ہے کہ عورت کو تعلیم دیجائے یا نہیں، کیونکہ وہ تو بہر حال ہو کر رہیگی بلکہ غور طلب امر یہ ہے کہ اس سیلاب کیلئے کونسی راہ ایسی نکالی جائے جو ہمارے نظامِ معاشرت کو تباہی سے بچائے - مغربی اصولِ تعلیم کے نتایج ہمارے سامنے موجود ہیں اور یوروپ کی عورت کی رسوا ذہنیت بھی ہم سے پوشیدہ نہیں، پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس کا نتیجہ وہاں کچھ اور ظاہر ہو، یہاں کچھ اور --- علاوہ اس کے اب یہ مسئلہ قیاس و نظریہ کی حد سے گزر کر عمل و نتیجہ کی صورت میں ہمارے سامنے آگیا ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ مغربی تعلیم نے ہندوستان کی عورت میں کیسی خطرناک ذہنیت پیدا کر دی ہے اسلئے میں اسکا سخت مخالف ہوں کہ اس تجربہ کو جاری رکھا جائے اور صرف اس امید پر زندگی بسر کیجائے کہ ممکن ہے اعلی تعلیم ان نقایص کو دور کر سکے، کیونکہ جس چیز کو اعلی تعلیم کہا جاتا ہے اسنے مردوں کی ذہنیت میں کیا قابلِ فخر تغیر پیدا کیا ہے کہ عورتوں کی اصلاح کی توقع اس سے ہو سکے۔

میری رائے میں لڑکیوں کی ابتدائی تعلیم کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہر کتاب ان کے سامنے مادری زبان میں پیش کیجائے اور ان کے لئے ایک خاص نصاب ایسا مقرر کیا جائے جس میں مذہب و اخلاق کے سوا اور کچھ نہ ہو، لیکن مذہب سے میری مراد وہم پرستی نہیں بلکہ وہ نفسیاتی تعلیم ہے جو حُسنِ اخلاق و اصلاحِ معاشرت کی طرف مایل کرتی ہے - اسی کے ساتھ اُن کو فرایضِ خانہ داری اور نسوانی صنایع سے بھی آگاہ کرنا ضروری ہے کیونکہ بغیر اس کے وہ اپنے حقیقی فرایض ادا کرنے کی اہل نہیں بن سکتیں - علوم و فنون کی طرف زیادہ توجہ

کرنے کی ضرورت نہیں، البتہ تاریخ وجغرافیہ کے مبادیات اور ریاضی کا اتنا حصہ جو گھر کے حساب کتاب کے لئے ضروری ہے، یقیناً انھیں معلوم ہونا چاہئے۔ انشاء لطیف سے جہاں تک ممکن ہو بچانا چاہئے اور عشقیہ فسانوں کا مطالعہ بھی ان کو ممنوع ہونا چاہئے۔ اگر پانچ سال کی عمر سے لڑکی کی تعلیم شروع کی جائے تو زیادہ سے زیادہ دس سال کی عمر تک یہ تمام مراحل آسانی سے طے ہو سکتے ہیں۔ اسکے بعد یہ غور کرنا چاہئے کہ اس کا دماغ کس طرف مایل ہے اور فطرتاً وہ کس علم وفن کی طرف مایل ہے، اگر اس کا میلان کسی ایسے فن کی طرف ہے جو اس کو گمراہ کر دینے والا ہے تو اس کو دور کرنا چاہئے اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر تمام سہولتیں اسکی تکمیل کے لئے فراہم کرنا ضروری ہیں۔ غیر زبانوں کا مطالعہ لیکن اس حد تک کہ انکی معلومات میں اضافہ ہو نامناسب نہیں اور فنونِ لطیفہ میں نقاشی ہی ایک ایسی چیز ہے جو عورت کی پاکیزگی جذبات کا ساتھ دینے والی ہے، رہی موسیقی سو اسکی تکمیل کا زمانہ شادی کے بعد آتا ہے اور اسکی ذمہ داری تمامتر اُن کے شوہروں پر عاید ہونی چاہئے۔

یہ درست ہے کہ عورت کی تعلیم میں پردہ کی پابندیاں بڑی حد تک حارج ہوتی ہیں، لیکن پردہ اُٹھا دینے کا جو مفہوم آج کل عام طور پر پیشِ نظر ہے وہ بھی درست نہیں۔ پردہ کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ وہ عورت کے قواء جسمانی وقوار ذہنی کے نشوونما میں حارج ہوتا ہے، یعنی گھر میں ایک جگہ محصور رہنے کی وجہ سے اسکی صحت بھی خراب ہو جاتی ہے اور اسکو اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کا بھی موقعہ نہیں ملتا، لیکن اگر اس نقصان کی تلافی صرف اس طرح ہو سکتی ہے کہ اسکا پردہ توڑ کر مردوں کی سوسائٹی کا آلۂ تفریح بنا دیا جائے، تو اس سے بدرجہا بہتر یہ ہے کہ عورت جہل وبیماری ہی کی حالت میں فنا ہو جائے۔ اسلامی پردہ اور غیر اسلامی پردہ کی بحث بیکار ہے، دیکھنا یہ ہے کہ زمانہ کا اقتضا کیا ہے اور معاشری مصالح کیا چاہتے ہیں۔ سو اس میں کلام نہیں کہ اگر ایک طرف زمانہ کا اقتضا یہ ہے کہ عورت کا پردہ توڑ دیا جائے تو دوسری طرف ہماری تہذیب معاشرت اس امر کی بھی مقتضی ہے کہ عورت کو ملک عام نہ بنا دیا جائے اور اس توازن کا قیام تعلیم سے زیادہ تربیت پر منحصر ہے۔ عورت کا پردہ دور کر کے یہ توقع رکھنا کہ وہ جایز حدود سے آگے قدم نہ بڑھائے گی مشکل ہے، کیونکہ آزادی کی لذت کبھی نہ پوری ہونے والی لذت ہے اور اسکی کوئی انتہا مقرر کرنا از بس دشوار ہے، اس لئے قبل اس کے کہ عورت کو اس لذت سے آشنا کیا جائے، اس میں یہ صلاحیت پیدا ہو جانا ضروری ہے کہ وہ خود اپنے مرتبہ وفرایض کو پہچان سکے اور یہ صرف اس تربیت سے پیدا ہو سکتی ہے جو والدین کے گھر میں اسے حاصل ہو نہ کہ اس تعلیم سے جو اسکولوں میں دیجاتی ہے ——— اس لئے مسئلۂ تعلیم سے زیادہ اہم سوال تربیت کا ہے اور اسکی تکمیل اسی وقت ہو سکتی ہے جب مرد اپنے طرزِ عمل میں تبدیلیاں پیدا کریں اور عورت کے اخلاق بلند کرنے کے لئے اس کی وہی عزت کریں جو اس سے چاہی جاتی ہے، ورنہ عورت کو ایک بار آزاد ہو کر مرد سے "انتقام لینا ضرور ہے"، خواہ وہ اس جذبہ کے ماتحت کتنی ہی ادنیٰ سطح پر کیوں نہ آجائے۔

اُردو ——— ہندی

جس طرف دیکھئے اسکولوں میں کالجوں میں "ترقی اُردو" کی انجمنیں قایم ہو رہی ہیں اور مادری زبان کی خدمت کا آوازہ ہر چہار طرف

سے بلند ہوتا ہوا سنائی دیتا ہے - غالباً اس لئے کہ ہندوؤں نے اُردو سے اپنی بیگانگی کا اظہار کرکے ہندی کی ترقی کو اپنا نصب العین قرار دے لیا ہے - بہرحال سبب یہ ہو یا کوئی اور اس جذبہ کے قابل قدر ہونے میں انکار نہیں، بشرطیکہ یہ کوشش کوئی علمی شکل بھی اختیار کرے اور باہمی نفرت و استکراہ کی کوئی صورت نہ پیدا ہو - مگر افسوس ہے کہ اُردو کی ترقی تو اتنی نظر نہیں آتی جتنی ہندو مسلمانوں کی باہمی مغایرت بڑھتی جاتی ہے اور میں اسکو ملک کی حد درجہ بدنصیبی سمجھتا ہوں ——— اگر مسلمان ہندوؤں سے اس لئے برہم ہوں کہ انھوں نے کیوں ہندی زبان اور ہندی رسم الخط کو اختیار کیا تو انکی سخت غلطی ہے کیونکہ یہ دور ہندوؤں کے ہنضت و بیداری کا ہے اور وہ اپنی ہر ہر چیز کو خاص ملکی رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں پھر اُردو جسکی ترکیب میں بڑا عنصر غیر ملکی بلکہ خالص اسلامی زبانوں کا ہے، کیونکر انکے لئے قابل برداشت ہوسکتی ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنی قدیم روایات تہذیب کو زندہ کرنے کے لئے اُس زبان اور اُس رسم الخط کو استعمال نہ کریں جس میں اُنکا تمام قدیم لٹریچر پایا جاتا ہے - جسوقت مسلمانوں کی حکومت تھی ہندو فارسی پڑھتے تھے اور ان کی غلامانہ ذہنیت نے اس احساس کو مٹا دیا تھا کہ حکومت کی زبان اختیار کرنا گویا اپنی ملکی و قومی تہذیب کو قربان کر دینا ہے، پھر اب جبکہ مسلمانوں کی حکومت کو مٹے ہوئے ایک زمانہ ہوچکا ہے اور اسکے بعد دو (ہندو) دوسری قائم ہونیوالی حکومت کو بھی اپنے زیر اثر لاچکے ہیں، یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ اپنے دورِ غلامی کی کسی یادگار کو قائم رہنے دیں اور اب بھی وہ اُردو کی حمایت کرتے رہیں جس کا ایک ایک لفظ اُن کے گزشتہ دورِ مغلوبیت کی یاد دلانے والا ہے ——— کہا جاتا ہے کہ اس تفریق و اختلاف کو مٹانے کے لئے ضرورت ہے کہ مسلمان اُردو سے فارسی و عربی کے ثقیل الفاظ نکال دیں، لیکن میری رائے میں یہ تدبیر کوئی نتیجہ نہیں پیدا کرسکتی کیونکہ اگر مسلمان اب بجائے فارسی و عربی کے سنسکرت کے الفاظ استعمال کرنے لگیں تو بھی ہندو اسوقت تک توجہ نہیں کرسکتے جب تک رسم الخط ہندی کا نہ اختیار کیا جائے - کیونکہ اُن کے لئے صرف اُردو زبان ہی قابل نفرت و استکراہ نہیں ہے بلکہ اسکا رسم الخط بھی مبغوض ہے کیونکہ وہ عربی کی نقل ہے اور اس خیال کے ساتھ ہی اُنکے وہ تمام جذبات ہیجان میں آجاتے ہیں جو مذہبی عناد و مخالفت اور اُنکے گزشتہ دورِ محکومیت سے وابستہ ہیں چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی زبان کو سنسکرت سے ملاتے جاتے ہیں یعنی اگر وہ اُردو کو ترک کرچکے ہیں تو اسی کے ساتھ یہ بھی پسند نہیں کرتے کہ مسلمان ان کی زبان کو اختیار کریں ——— بہرحال مسلمان اگر یہ چاہتے ہیں کہ ہندو پھر اُردو کی طرف مائل ہوں تو یہ خیالِ محال ہے، اسلئے اب اگر کوئی صورت اُردو کی ترقی کی (بلکہ میں تو بقا کا لفظ استعمال کرونگا) ہوسکتی ہے تو صرف یہ کہ مسلمان ہی اسکی نشر و اشاعت میں حصہ لیں اور جو بوجھ انھوں نے ہندوؤں پر ڈال رکھا تھا اس کو خود ہی اُٹھائیں - لیکن افسوس ہے کہ جہاں مسلمانوں کی علمی زندگی میں اور بہت سے صفر نظر آتے ہیں، وہیں ایک صفر یہ بھی پایا جاتا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ظاہری چیخ پکار بھی زیادہ عرصہ تک قائم رہ سکے گی ——— میں نے جو کچھ عرض کیا وہ ممکن ہے بانیانِ "انجمن ترقی اُردو" کو پسند نہ آئے، لیکن کوئی حقیقت محض اس لئے کہ وہ تلخ ہے چھپائی نہیں جاسکتی - وہ حضرات جن کا تعلق دنیائے صحافت یا تصنیف و تالیف سے نہیں ہے اُنکو مسلمانوں کی بے حسی کا صحیح علم نہیں ہوسکتا، لیکن جو چند افراد بدقسمتی سے اس مشغلہ میں مبتلا ہیں، اُن سے پوچھئے کہ اُردو زبان کس دور سے گزر رہی ہے اور اس کے نام لیوا کس طرح زندگی بسر کر رہے ہیں ——— ہندوستان

ہیں مسلمانوں کی تعداد آٹھ کروڑ سے زیادہ ہے، لیکن اُن کے کتنے اخبار کتنے رسایل اس وقت پائے جاتے ہیں اور جو پائے جاتے ہیں وہ کس عالم میں ہیں؟ اس کا بیان حد درجہ دردناک و تکلیف دہ ہے ہندوؤں کا میلان ہندی کی طرف گزشتہ بیس سال کے اندر ہوا ہے، لیکن اسی قلیل مدت میں جو ترقی اُنکی صحافت نے کی ہے اسکو دیکھکر حیران رہجانا پڑتا ہے ـــــ ہندی کا بدنصیب سے بدنصیب رسالہ کوئی ایسا ہوگا جسکی اشاعت ہزاروں سے کم ہو اور اُردو میں بہترین معیاری رسایل کے خریدار سیکڑوں سے متجاوز نہیں ہوتے، ہندی کتابیں ہزاروں کی تعداد میں ہر سال نکل رہی ہیں اور ایک اڈیشن شایع ہوا نہیں کہ دوسرے اڈیشن کی طیاریاں ہونے لگتی ہیں، لیکن اُردو تصانیف کا یہ عالم ہے کہ اگر کسی کتاب کے دو سال کے اندر بھی ایک ہزار خریدار پیدا ہوجائیں تو سمجھ لیجئے کہ بڑا کمال ہوگیا ـــــ پھر کیا یہ حیرتناک امر نہیں کہ ایک طرف تو آپ کے احساس کا یہ عالم ہے کہ ہندوؤں کی علٰحدگی کو بھی آپ یہ سمجھتے ہیں گویا آپ کا کوئی حق انھوں نے چھین لیا ہے اور دوسری طرف غیرتِ عمل کا یہ حال ہے کہ ہندو تو ہندو خود آپکو بھی اپنے فرض کا احساس نہیں ـــــ میں پوچھتا ہوں کہ وہ لوگ جو اُردو کے حامی ہیں، وہ خود کتنی قربانیاں اس حمایت میں کر رہے ہیں، کیا اپنے قلب پر ہاتھ رکھکر کہہ سکتے ہیں کہ اُردو رسایل و تصانیف کی خریداری پر جتنی رقم صرف کرتے ہیں کیا وہ اس رقم کے دسویں حصہ کے بھی برابر ہو پہنچتی ہے جو سیر و تفریح میں اُڑجاتی ہے اور کیا ان کا انتہائی ذوقِ علم و ادب اس سے آگے کبھی بڑھا ہے کہ اپنے کسی دوست یا عزیز سے عاریتاً لیکر کسی رسالہ یا تصنیف کو پڑھ لیا کریں ـــــ حقیقت یہ ہے کہ اس نوع کی انجمنوں کا قیام صرف تفریحی اُپج ہے اور اُس بیجا نمود و نمایش کے علاوہ کچھ نہیں جو اس زمانہ میں "فیشن" کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ ہندوستان کی اور یونیورسٹیوں کا ذکر نہیں، لاہور، لکھنؤ، الہ آباد، اور آگرہ کو لیجئے جہاں مسلمان طالب علموں کی تعداد کثرت سے پائی جاتی ہے، کہ ہزار میں ایک طالب علم بھی ایسا نہیں جو اُردو رسایل یا اُردو تصانیف کے مطالعہ کا شوق نہ رکھتا ہو، بلکہ اکثر کا تو یہ حال ہے کہ وہ اپنی مادری زبان کا مطالعہ تہذیب و سنجیدگی کے خلاف سمجھتے ہیں۔ برخلاف ہندو طلبا کے کہ اگر وہ دن میں آٹھ گھنٹے اپنی کورس کی کتابوں میں صرف کرتے ہیں تو ایک گھنٹہ ہندی رسایل کیلئے بھی نکالتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ جہانتک ممکن ہو انکی اشاعت بڑھے۔ انگریزی داں جماعت کا خیال ہے کہ اُردو کے رسایل نہایت ذلیل ہوتے ہیں اور انکا مطالعہ کرنا وقت ضایع کرنا ہے۔ اول تو ان کا یہ خیال ہی سرے سے غلط ہے، کیونکہ بدقسمتی یا خوش قسمتی سے انکو اُردو سمجھنے کا سلیقہ ہی نہیں اور ہو کیونکر جبکہ وہ اُدھر آنکھ اُٹھاکر دیکھنا بھی اپنی توہین سمجھتے ہوں۔ لیکن اگر تھوڑی دیر کیلئے اسکو صحیح باور کرلیا جائے تو بھی میں پوچھ سکتا ہوں کہ کیا اس کے ذمہ دار ہمارے تعلیم یافتہ افراد نہیں ہیں اور کیا انکا فرض نہیں ہے کہ وہ اپنی زبان کی خدمت کریں ـ لیکن استغفر اللہ میں کس سے پوچھتا ہوں؟ اُنسے جو قومیت کے جذبہ سے معرا، اجتماعیت کے اُصول سے ناآشنا اور وطنیت کے مفہوم سے قطعی ناواقف ہیں ـــ وہ جن کی تہذیب دوسروں سے گدائی کی ہوئی اور جنکی عزتِ نفس اک جنسِ گم گشتہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

میں ۷ ستمبر کو حیدرآباد پہونچا اور آج کہ ستمبر کی ۲۸ ہے یہیں مقیم ہوں یہاں کے خنک و خوشگوار موسم اور جاں بخش و جانفزا سرد ہواؤں میں بھی لکھنؤ کی گرمیاں یاد آرہی ہیں اور تڑپ رہا ہوں کہ کسی طرح جلد سے جلد پھر اپنے اُسی زاویۂ خموش میں پہونچ جاؤں جسکی ویرانیاں بھی مجھے عزیز ہیں، لیکن محبت کی زنجیروں کا کیا علاج جو یہاں پہونچکر میرے پاؤں میں ڈالدی جاتی ہیں بہرحال رہائی کا وعدہ تو کسی نہ کسی طرح حاصل کرلیا ہے لیکن اکتوبر کے دوسرے ہفتہ میں۔ اس اظہار کی ضرورت صرف اسلئے محسوس ہوئی کہ ممکن ہے اس دوران میں بعض احباب کے خطوط کا جواب بروقت نہ دے سکا ہوں، اور وہ اس تعویق و تاخیر کو بجائے مجبوری کے میری سرکشی پر محمول کریں۔

نیاز

عہد وسطیٰ کے فنون لطیفہ اور اسلام

فرانسیسی زبان میں (Elie Faure) کی ایک کتاب آرٹ کی تاریخ پر چار جلدوں میں شائع ہوئی ہے، جس کا ترجمہ انگریزی میں (Walter Pach) نے کیا ہے۔

پہلی جلد قدیم آرٹ پر ہے، دوسری عہد وسطیٰ سے متعلق ہے، تیسری میں عہد نُہضت سے بحث کی گئی ہے اور چوتھی میں موجودہ دور کا ذکر ہے۔

یہ تصنیف انشار کی بلندی، جوشِ تحریر اور نزاکتِ خیال کے لحاظ سے بجائے خود ایک بے مثل نمونہ آرٹ کا ہے اور اس کے دیکھنے کے بعد ماننا پڑتا ہے کہ ایسی چیز صرف ایک فرانسیسی دماغ ہی پیش کر سکتا تھا۔

میں نے اس کتاب کے بعض ابواب کو بیسیوں مرتبہ دیکھا اور ہمیشہ اس نیت سے کہ اس کا ترجمہ اُردو میں کیا جائے، لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ سارا وقت اس کی لذتِ انشا میں صرف نہ ہو گیا ہو اور اسے اپنی زبان میں ظاہر کر سکنے کی ہمت پیدا ہوئی ہو۔ اس کے خوبصورت و شاندار الفاظ، اس کی نازک ترکیبیں جو فرانسیسی و ترکی انشار کی خصوصیات میں داخل ہیں، یقیناً کسی اور زبان میں منتقل نہیں ہو سکتیں اور اس لئے اگر میں آج کی صحبت میں اس کے ایک باب کا ترجمہ پیش کر رہا ہوں تو اس خیال سے نہیں کہ میں اس کا ترجمہ کرنے میں کامیاب ہوا ہوں، بلکہ صرف اس لئے کہ جو لوگ مجھ سے زیادہ اہل ہیں وہ اسکا مطالعہ کریں اور اگر اُردو میں بھی اس کی انشار کی تمام خصوصیات کو قائم رکھنا ممکن ہے تو ضرور اس کی کوشش کریں کیونکہ اگر یہ کتاب تمام و کمال اُردو میں آجائے تو میں اس کو معجزۂ ادب سمجھوں گا۔

اسکی چاروں جلدیں سو روپیہ میں تھیکر کمپنی بمبئی سے مل سکتی ہیں، لیکن اگر کوئی صاحب یہ صرف برداشت نہ کر سکیں تو مجھ سے عاریتاً لے سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ ترجمہ کرنے کی اہلیت پہلے مجھ پر ثابت کر دیں۔ نیاز

دو مذہب باہم متقابل ہو جاتے ہیں اور ڈرامہ شروع ہو جاتا ہے، لیکن یہ حقیقت نظر انداز نہیں ہو سکتی کہ اسلام جن خیالات کو مغربی تہذیب و تمدن کے سامنے پیش کر رہا تھا وہ بہ لحاظ نتائج اُن خیالات سے کہیں زیادہ تھے جنھیں مسیحیت اسوقت تک مشرقی تہذیب کے سامنے پیش کر چکی تھی۔

اسلام، جس نے ایک بے لاگ مذہب کا بدویانہ جوش پیدا کر کے غریب لیکن آزاد عربوں کو کرۂ زمین کی تسخیر پر آمادہ کر دیا تھا۔ وہ اسلام جس کے پیرو خیموں کے سوا کوئی گھر نہ رکھتے تھے اور جن کا منتہائے نظر خواب کی سی لانہایت دنیا کو اپنے بادپا گھوڑوں کی رفتار اور گرد و غبار کا طوفان لے آنے والی ہوا کے ساتھ مسخر کرنا تھا۔ ہاں وہی اسلام عہد وسطیٰ میں اس آرزوئے ناتمام کو لیکر نمودار ہوا جس کے سمجھنے کی جتنی کوشش کی جاتی ہے اسیقدر وہ ہمیں عمان مستقبل میں غرق کرتی چلی جاتی ہے۔

جب فرمانروائے روم جسٹی نین نے پایۂ تخت یونان کی درسگاہوں کو بند کر کے ماہرین فنون اور علما کو سلطنت سے نکال دیا (یہ تقریباً وہی زمانہ تھا جبکہ گریگوری اعظم نے پلاٹینی کتبخانہ جلا کر خاک کر دیا تھا) تو وہ ایران کی دولت ساسانی کی ہی آغوش تھی، جس نے ان تمام خانماں برباد یونانیوں کو پناہ دی۔ حقیقت یہ ہے کہ یاوری قسمت کی بھی بعض عجیب و غریب شاندار مثالیں ملتی ہیں۔ جب سرزمین رستم و اسفندیار پر اہل عرب کا استیلا ہوا اور وہ گنج بادآورد کے مالک ہو گئے تو یہی عرب تھے جنھوں نے قدیم تہذیب کے اندر جدید یورپ کی بنیاد ڈالی یعنی جسوقت فضائے مغرب پر ظلمت کی گھٹائیں چھا رہی تھیں اُسوقت خلفائے اسلام یونیورسٹیاں کھول رہے تھے۔ نہریں جاری کر رہے تھے "جنات عدن" کی داغ بیلیں ڈال رہے تھے، مساحت، و ریاضی، جغرافیہ و طب کا احیاء کر رہے تھے، اور مفتوحہ ممالک کو "کاروانسرائوں"، مساجد اور محلات کی تعمیر سے آراستہ بنا رہے تھے، گویا ایک تاریک پس منظر میں الف لیلہ کی کوئی داستان طیار کی جا رہی تھی۔

عرب ذہنیت کا محیر العقول کمال یہ تھا کہ وہ جہاں کہیں بھی گئی اپنی خصوصیت ہاتھ سے نہیں دی اور باوجود اپنی طرف سے کوئی نئی بات پیدا نہ کرنے کے تمام اذہان پر غالب رہی۔ عرب کی یہ ہنگامہ آرا بدویانہ لیکن متحد ذہنیت جو اخلاقی حدود سے بے نیاز اور مادی قیود سے مبرا تھی، محض اسی خصوصیت کے وجہ سے اپنے اور مفتوح اقوام کے خصائص میں ربط پیدا کر کے مغلوب قوموں کو انھیں متحدہ خصائص میں جذب کر لیتی تھی۔ مصر میں قبطی، مغرب اقصیٰ اور ہسپانیہ میں بربر، ایران میں عجمی اور ہند میں ہندوستانی بنکر اسلام نے نومسلم قوموں کو اپنی اپنی طبیعت کے موافق اس جوش و خروش کے اظہار سے کبھی باز نہیں رکھا جو وہ ان قوموں میں پیدا کر دیتا تھا، الغرض اسلام جہاں کہیں

بھی پہونچا وہ لوگوں کے دلوں کا مالک بن کر رہا۔

جب رسول اللہ کی وفات کے بعد ابوبکرؓ نے اعلان جہاد کیا تو مصر و شام کے فاتحین نے بازنطینی اور قبطی کنائس میں جو بھی ان کے سامنے آئے اپنے مذہب کے اثرات قایم کرنے میں کبھی تامل نہ کیا۔ انھیں اس بات کی کوئی پرواہ نہ تھی کہ پہلے کوئی مقام کتنا مقدس اور کس قدر متبرک تھا۔ وہ جہاں پہونچے مخلی بالطبع ہو کر پہونچے اور کنائس کے در و دیوار پر جو تصاویر نظر آئیں ان پر انھوں نے رنگ پھیر کر قبلہ رُخ دیوار میں ایک محراب کھود لی اور اسی جگہ عبادت میں مشغول ہو گئے۔ مصری۔ یونانی یا رومی خرابوں میں جہاں کہیں اُن کو پُرانے ستون یا فیلپائے ملے انھوں نے جمع کر کے سر اور پایہ کا خیال کئے بغیر قطار اندر قطار نصب کر دیا اور اندرونی صحن میں فوارہ کے اردگرد وضو کے لئے متوازی قطاروں پر مخروطی شکل کی محرابیں قایم کر دیں۔

اس حال پر تین صدیاں گزر جاتی ہیں اور دورِ فتوحات ختم ہو جاتا ہے، یعنی اسلام حدبِ ایران سے کوہستان پیری نیز تک پھیل جاتا ہے اور خانہ بدوش عرب اپنی ولایات مفتوحہ میں جو طاقتیں انمیں سست پڑ گئی تھیں انھیں از سر نو بیدار کرتا ہے۔ اور اس بات پر آمادہ ہو جاتا ہے کہ اپنی روح عمل سے مفتوحہ اقوام وملل کے قوائے عمل میں بیداری پیدا کر دے۔ تمام نخلستان جو افریقہ کے ریگستانوں اور ہسپانیہ میں پھیلے ہوئے تھے، سفید سفید شہروں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جو کنگورے دار فصیلوں سے محصور ہیں، جلدی جلدی محلات و قصور معہ سایہ دار درختوں کے پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ جن کی راحت بخش ٹھنڈ میں آرام و آسائش حاصل کرنے کے لئے ریگزاروں کا سفر کر کے امراء آتے ہیں۔ اور اب جو فوج یا قافلہ ریگ رواں کے بے پایاں سمندر کو عبور کر کے آتا ہے تو اُسے سرابی منظر کے بجائے ایک گلابی یا نیلگوں دھندلکا نظر آتا ہے جس کے ہلکے پردہ میں مکانوں کی کرسیاں۔ محلوں کے پشتے گول ستون اور مینار جھلملاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

مسلم روح میں اُسوقت بھی جبکہ وہ بزعم خود اپنی مالک آپ تھی، کبھی اس قابل نہیں ہوئی کہ سراب یا ٹھنڈے سایہ سے زیادہ کسی چیز پر قابض ہو سکے۔ یہ سایہ بھی وہ سایہ تھا جو ایک ساعت کے لئے شعلوں کی دو چادروں کے درمیان جس پر سے فاتحین اسلام گزرے پیدا ہو جاتا تھا۔

جب مسلمانوں کے سیلاب عظیم کی رو ختم ہو گئی جب وہ آرزوئیں جو ہمیشہ ان کے آگے آگے موج دریا کی طرح چلتی تھیں کسی بحر ذخار یا سلسلۂ کوہستان، یا بائزنطیم کی دیواروں یا فرنگی فوجوں کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکیں تو انھیں کسی اور راستہ کی تلاش ہوئی، اور چونکہ اب افق بھی مسدود ہو گیا تھا، اس لئے انھوں نے آسمان کی طرف

سر اُٹھایا اور اس طرح وہ بھی بائزنطینی گنبدوں کی صورت میں نمودار ہوئیں، اور کبھی مصری محلات کی چھتوں کی شکل میں محلات شاہی کے جلوخانوں کی بھاری بھاری نیم دائرہ محرابیں ٹوٹ چکی تھیں اور ان کی جگہ اوپر کی طرف رخ کرنیوالی شکستہ محرابوں نے لے لی تھی۔ اسی طرح گنبد کے دائرہ نے بھی مخروطی صورت اختیار کرلی تھی اس کی وضع قدیم آشوری طرز کی ہوگئی تھی جو قبل اسلام آل ساسان کے ایران میں رائج تھی۔ یہ سبک بیضوی وضع کے گنبد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بنانے والوں کی آرزوئیں ہیں جو فضا میں بلند ہوکر غائب ہوجانا چاہتی ہیں گنبد کے نچلے حصہ کو تنگ کردیا گیا یہاں تک کہ یہ معلوم ہی نہ ہوسکے کہ وہ کہاں سے شروع ہوا ہے۔ اور اس طرح گویا لامحدود کائنات کے معلق ہونے کا راز سمجھ میں آجائے چودھویں صدی کی ابتدا میں ستون غائب ہوجاتے ہیں کیونکہ گرجاؤں کی عظیم سادگی کو دیکھ کر ان کے دل میں ریگستان کا تصور پیدا ہوتا تھا اور قدرتاً انھیں اس طرف مایل ہوجانا چاہیے تھا، چنانچہ اس کے بعد ہی گنبد کے ساتھ ساتھ گرجا کی شکل کے بلند مینار بھی قائم ہوگئے جن سے موذنوں کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ ترکوں نے جن کا ذوق ایرانی ظروف کے نقوش سے زیادہ وابستہ تھا، پھیلے ہوئے گنبدوں کی بائزنطینی گولائی قائم رکھی جو خود تو سیاہی مائل سرو کے جھنڈ میں چھپے ہوئے ہوتے تھے لیکن ان کے بلند مینار فضا میں اُبھرے ہوئے نظر آتے تھے۔ اسی طرح ترک گویا غیر شعوری طور پر بائزنطیم کے جاہ وجلال اور شان وشوکت کا وارث بن گیا اور اس نے نہ ان رنگین پتھروں کے سلسلہ کو دیکھا جو نور صبح کے ساتھ جگمگا اُٹھتے اور ظلمت شب کے ساتھ ماند پڑجاتے ہیں۔ نہ ان کی نظر ان طلائی گنبدوں پر پڑی جن کی سطح پر رات ہونے تک آتش شفق کے شعلے کھیلتے رہتے ہیں۔ لیکن ترکوں کو چھوڑ کر تمام مسلم ماہرین فن تعمیر مصر سے لیکر ہسپانیہ تک سر بلند غرفوں اور لمبوترے گنبدوں کی طرف فطرتاً مائل رہے اور جو اظہار ہنرمندی کے لئے گنبدوں کی تقسیم وسطی حصص مساجد کی ترتیب اور ہتھیاروں کی وضع قطع بھی بدلدیتے تھے چنانچہ انھیں کبھی گول بناتے تھے کبھی چوکور کبھی ہشت پہلو کبھی صاف اور کبھی ابردار بناتے تھے۔ مصری مساجد البتہ روحِ صحرا کی طرح ہمیشہ سادہ اور صاف رہیں۔ لیکن مغرب اقصیٰ اور ہسپانیہ کی مساجد میں سیاہ وسفید پتھروں کے بنے ہوئے محرابدار چھتے رائج ہوئے اور گول ستونوں کی بلندی بھی دگنی ہوگئی گویا وہ کھجور کے درخت تھے جن کی چوٹیوں سے ان کے لمبے لمبے پتے نکلتے ہیں۔ قرطبہ کی عالیشان مسجد جو اس زمانہ میں تعمیر ہوئی تھی جب مسلمان اپنے دین پر سختی کے ساتھ قائم تھے، قریب قریب ایسی معلوم ہوتی ہے جیسا کوئی گنجان جنگل۔ اس کے سایوں میں بیٹھ کر جو خاموش روشندانوں کی مسلسل قطاروں کے باعث اور بھی زیادہ تاریک ہوگئے ہیں انسان کو خیال گزرتا ہے کہ وہ کسی ایسی ہیبت ناک دنیا میں پہونچ گیا ہے جس کا ادراک محال ہے۔

(۲)

مغرب اقصیٰ کے ماہرین فن تعمیر اپنے محرابدار چھتوں کی وضع قطع میں کافی تفریق پیدا کر دیتے تھے - ایک ایوان سے دوسرے ایوان کا منظر، ایک حجرہ سے دوسرے حجرہ کی صورت شکل، مسجدوں کی تعمیر، قصور شاہی کا نقشہ باہم دگر مختلف ہوا کرتا تھا - اُندلس کے محلات الحمرا ایسی تعمیریں ہیں جہاں انسان کو سرخ، سنہرے، سیاہ، زمردیں یا فیروزی ایوان بھی نظر آتے ہیں اور ستونوں پر قایم ہونے والے عظیم الشان دالان بھی اور جہاں آراستہ باغات بھی ہیں اور شفاف مرمریں حوض بھی۔ ذی روح چیزوں کی تصاویر سے اقصائے مغرب کے ماہرین تعمیرات کا ذہن قطعی خالی تھا لیکن وہ یکسانیت رفع کرنے کیلئے اس امر کی سخت کوشش کرتے تھے کہ خطوط کے اختلاف سے خوبصورتی و دلکشی پیدا کی جائے، چنانچہ قوسی محرابوں کے گوشے اندر کی طرف جھکنے لگے اور جھکتے جھکتے محراب کی صورت ایسی ہو گئی جیسے گھوڑے کے نعل - پھر محراب کو تنگ کیا گیا اور سامنے کا حصہ کم کر کے اس کے خطوط منحنی کر دئے گئے - کناروں پر محراب در محراب بنائی گئی - یا شہد کی مکھی کے چھتہ کی طرح چھوٹے چھوٹے خانے بنائے گئے اور حاشیوں پر استرکاری کر کے بیل بوٹوں سے مزین کر دیا گیا - جب یہ کام بھی عام ہو گیا تو پچی کاری کا رواج ہوا اور پتھروں کو کھود کھود کر پھول پتیاں نصب کی گئیں -

جب خطوط کے ذریعہ سے نقش و نگار بنانے کا کام کمال کو پہونچ گیا تو اس کی دسترس سے مسجد بھی نہ بچیں اور یہاں بھی فرش سے لیکر گنبد کی چوٹی تک نقش و نگار نظر آنے لگے - اور عربوں کو کافی فرصت مل گئی کہ وہ اپنے بیل بوٹوں میں نئی نئی ترکیبیں اور نئی نئی باتیں پیدا کرتے - پر پیچ و خم گلاب کی بیلوں - مختلف ہندسی شکلوں، خوبصورت کتبوں اور طغروں میں انھوں نے اپنے ذوق آرائش کو صرف کر دیا اور خطوط کے انحنا، اس کی عمودیت اور پیچ و خم کو اس قدر ترقی دی گئی کہ وہ مربعوں، دائروں، موٹی لکیروں، بیضوی شکلوں سے جیومیٹری کی سخت اور صحیح شکلوں تک پہونچ گئے اور وہ چیزیں جو دیوار سے علیحدہ ہوتی تھیں مثلاً منبر وغیرہ ان پر بھی جالیوں اور پر پیچ و خم خطوط کے ذریعہ سے نقش و نگار بنائے گئے گویا معلوم ہوتا تھا کہ دیواروں اور محرابوں کو کسی نے غرفوں سے آنے والی روشنی کو تقسیم کرنے اور بعض اوقات گنبدوں اور گاؤدم میناروں کو ڈھانکنے کے لئے مشجر اور چکن کے تھان پھیلا دئے ہیں - جیومیٹری کی شکلوں کے ذریعہ سے آرائش و زیبائش کا فن خود بخود کبھی پیدا نہیں ہو سکتا تھا بلکہ وہ نتیجہ تھا مظاہر قدرت کے مطالعہ کا اور یقیناً اس نے اول اول کوئی نہایت سادہ شکل اختیار کی ہوگی، چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ گلکاری کا کام پھول پتیوں کا گلدستہ بنانے سے پیدا ہوا - جیسا کہ قاہرہ کی

جامع ابن طولون کی محرابوں کے اطراف میں بنے ہوئے پھول بوٹوں سے ظاہر ہوتا ہے اور یہ وہ وقت تھا جبکہ فتوحات کے بعد عربوں کا تخیل کسی قدر راحت پسند ہوگیا تھا اور اسے نازک ہونے کی فرصت ملگئی تھی جب چوتھویں صدی نے اپنا ضابطۂ آرائش وزیبائش وضع کیا تو اسوقت تخیل عرب بہت بلند ہو چکی تھی۔ جب لوازم فن آرائش وزیبائش میں کثیر الاضلاع وکثیر الزوایا اشکال کا استعمال رائج ہوا تو عرب جیومیٹری دانوں نے اس امر کی کوشش کی کہ اس سے ایسے عام اُصول اخذ کئے جائیں کہ وہ ان اشکال سے عام زیبائش وتزئین کا کام لے سکیں چنانچہ اس وقت سے عربی فن نقاشی ایک صحیح ومستقل فن بن گیا اور اسنے اتنی ترقی کی کہ تصورات ربانی کو بھی انھیں اشکال میں متشکل کرکے دکھادیا۔

عربی روحانیت ریگستان میں پیدا ہوئی جہاں صرف فضائے بسیط کی حکومت ہے اور جس کا نہ کوئی آغاز ہے نہ انتہا اس لئے انھوں نے بیل بوٹوں میں اتنی ترقی کی کیونکہ ان بیلوں کی بھی نہ کہیں ابتدا ہے نہ انتہا اور ان کو دیکھ کر نگاہ کا کسی ایک جگہ جاکر رک جانا محال ہے۔ یہ بیل بوٹے گویا ہیں گویا عالم ملکوت کی وہ آوازیں ہیں جنکو اول اول ہم کسی اور جگہ سے پیدا ہوتے ہوئے محسوس کرتے ہیں لیکن جب غور کرتے ہیں تو وہ اپنی ہی آواز معلوم ہوتی ہے — فن بھی خود زندگی کی طرح سے اصول ارتقاء کا پابند ہے، اگر تکمیل فن کی خواہش کے بجائے سائنٹفک تحقیق کا ذوق رکھدیا جائے تو اس کے اندر جد وجہد فنا ہو جائے گی اور اس کا جوش وخروش سرد پڑجائے گا اگر ریاضیات کو آرٹسٹ کے حلقۂ عمل میں داخل کیا جائے گا تو وہ ماہرین فن کے ہاتھوں میں صرف ایسا اوزار بن کر رہے گا جس کا مقصد فن تعمیر کی منطقی حیثیت نُمایاں کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر کسی قوم کا فن تعمیر اسے سنگ تراشی یا بت تراشی سے روکتا ہے تو اس کے معنے صرف یہ ہیں کہ وہ ہمیشہ بے معنی خطوط کا غلام رہیگا اور اس کے اندر کبھی زندگی پیدا نہ ہوگی۔

(۳)

یہ سچ ہے کہ عربوں نے آرٹسٹ کو کبھی مجبور نہیں کیا کہ وہ ذیروح مخلوق کی تصویریں بنانے سے قطعی پرہیز کرے۔ اور بعض اوقات اس قسم کی تصویریں ہسپانیہ اور مراکش کے مساجد وقصور کی دیواروں پر نظر بھی آتی ہیں تاہم تمام موحد قوموں کی طرح جو ریگستانوں میں بنیں قوم عرب بھی ذیحیات چیزوں کی اشکال وصور سے نفور ہونے میں صرف اپنی جبلّت کی متابعت کرتی تھی۔ مذہب جبلّت کو صرف دور انحطاط وزوال میں دباتا ہے۔ لیکن جب طاقتیں عروج پر ہوتی ہیں تو جبلّت مذہب کو بھی اپنے ساتھ کھینچ لے جاتی ہے۔ مصر وشام کے فنون اسلامیہ میں

وہی ریگستان کی عُریانیت، وہی ریگستان کی اُداسی اور وہی ریگستان کی شان وشوکت پائی جاتی تھی، مغرب اقصیٰ اور ہسپانیہ کے ٹھنڈے حجروں کی گہرائیوں میں خلفاء اکثر حکماء و فلاسفہ کی باتیں سنتے تھے اور جب ان کے فوجی رسالے فتوحات ملکی اور تاخت وتاراج کے بعد واپس آتے تھے تو یہ اکثر لیموں کے درختوں کی خوشبو سے متمتع ہوا کرتے تھے۔ اسلامی فن ایسا معلوم ہوتا تھا گویا جمے ہوئے خون میں سونے کی اینٹیں رگڑ رگڑ کر اس سے کام لیا گیا ہے۔ ہندوستان میں اس فن نے مادی دنیا کی تمام موجودات کو حکم دیدیا کہ وہ سیلاب کی طرح چاروں طرف سے امڈ کر آئے اور اس میں شامل ہو جائے۔ اور ایران میں تو یہ فن گویا ایک خیابان گل و ریاحین تھا۔ سرزمین ایران کو مشرقی سواحل بحرۂ روم کے ریتیلے میدانوں یا اندلس و مراکش کی وادیوں سے کوئی مشابہت نہیں جہاں سخت ظلمت اور آگ کے شعلوں میں ہمیشہ جنگ ہوتی رہتی ہے۔ جانب غرب ان بالائی علاقوں میں جو وسطی ریگستان کے حدود پر واقع ہیں اور سطح آب سے تین ہزار میٹر بلند ہونے کی وجہ سے گرد وغبار سے بہت دور اور اسی قدر ستاروں سے قریب ہیں، ہوا میں بلور کی سی صفائی پائی جاتی ہے۔ نسیم جانفزا کے جھونکوں میں یہاں کے سفید مرغزار اور گلابی سبزہ زار ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ایسے بچھے نظر آتے ہیں جیسے نم آلود ریشم کے تھان۔ اور فصل بہار سے موسم خزاں تک یہاں کے کشادہ لالہ زاروں اور کھیتوں میں ہلکے سبز رنگ سے لیکر سنہرے زرد رنگ تک تمام قسم کے موہوم رنگوں کا ایک طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ آسمانوں میں جہاں کبوتر اڑتے رہتے ہیں اور بادلوں میں وہ تمام ہلکے اور نازک رنگ موجود رہتے ہیں جو اوائل فصل بہار میں نظر آتے ہیں۔

جب کوئی ان شہروں کے قریب پہونچتا ہے تو وہاں کے بیضوی یا بلدار کرخی گنبد۔ اور ان کے بلند مینار جو سرو اور سال کے درختوں میں سے اُبھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ عجیب وغریب مناظر پیش کرتے ہیں گویا نیلے، فیروزی، پیازی، سبز اور زرد رنگوں کو شبنم میں گھول کر افق کی سطح پر تصویریں بنائی گئی ہیں۔ اس نظارہ کا لطف اس آرٹسٹ کو خوب معلوم ہے جس نے براہ کارواں صحرا کے نخلستانوں کی سیر کی ہے۔ شکستہ دیواریں، پھٹے ہوئے گنبد اور مینار جن پر سیاہ سفید خطوط کے نقش ونگار محو ہوتے جارہے ہیں۔ لیکن یہ جو روغن ان پر چڑھایا گیا ہے، وہی قدیم کلدانی روغن ہے جو ایران قدیم نے چین کو بتایا اور جو تاتاری ترکتازوں کے ساتھ پھر ایران میں آگیا۔ یہ البتہ ابھی تک شیشہ کی طرح پوری آب وتاب کے ساتھ درخشاں ہے۔ سنہری گلکاریوں اور سفید کتبوں پر جو مختلف قسم کے پھول بوٹے بنے ہوئے ہیں ان میں ان بنفشئی، نیلے، سفید، لاکھی اور زرد رنگوں کی جھلک عجیب لطف پیدا کرتی ہے روغنی مسالہ کی تہ میں جڑے ہوئے دروازوں کی بلند چوٹیوں کے نیچے۔

فیروزوں، نیلم پاروں اور لاجورد کے مدہم رنگوں کی چمک کے باعث ایک متحرک خط شعاعی دکھائی دیتا ہے اندر کی جانب گنبدوں کی مدور خوشنمائی میں بیل بوٹوں کا جال بچھا کر اس میں ایسے شاخسانے نکالے گئے گویا آویزے لٹک رہے ہیں۔ بعض گنبدوں کے اندر شیشہ کی ایسی لوحیں نصب کی گئی جن سے چاروں طرف کرنیں پھوٹی پڑتی ہیں۔

قدیم زمانہ میں لوگ عجمی قالین دیواروں پر آویزاں کیا کرتے تھے جو ایسے معلوم ہوتے تھے گویا قلبہ رانی کرنے کے بعد سیاہی مائل زمین میں سبد ہائے گل پامال کردئے گئے ہیں، لیکن سولھویں صدی کے آخر میں جب شاہ عباس اعظم صفوی نے اصفہان کی تعمیر کا حکم دیا تو ان قالینوں کی جگہ چمکدار روغنی اینٹوں نے لے لی۔ اُس وقت ایران میں جو طبقہ اہل فن کا پیدا ہوا اسے اُن لوگوں کی ہدایات اور مشوروں پر چلنا پڑا جنھوں نے روغنی مساجد کو تمام دولت زینت و زیبایش بخشی تھی۔ تاکہ جہانگیر اور مانی اور خصوصاً بہزاد کے موقلم کی جنبشوں سے اسلامی فن کو غیر معمولی علوئے مرتبت و رفعت حاصل ہو جائے، حرفت کوزہ گراں نے بھی جو دنیا میں سب سے قدیم اور پائدار پیشہ ہے، فن اسلامی کو اپنی طرف سے ضروری حصہ دیا۔ اس کی آراستگی جس میں ذیروح کی تصویریں زیادہ نہیں ہوتیں اپنی دلکش نوعیت کے لحاظ سے یقیناً بہت بلند ہے۔ ان ظروف پر گل و ریاحین لہلہاتے ہوتے ہیں، آسمان کی وسعتیں مع اپنے مرواریدی امواج سحاب کے نظر آتی ہیں اور سمندر کی پہنائیاں مع اپنی درخشاں سطح کے منقوش ہوتی ہیں۔ رنگین خطوط، رنگ کے چھینٹوں، پھولوں کے دستوں اور مختلف رنگوں کے اختلاط باہمی سے ایسے ایسے مناظر نقش کئے جاتے ہیں کہ تصور مسحور ہو جاتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ نقاشان عجم کا یہ چمنستان جس طرح اچانک وجود میں آیا تھا اسی طرح وہ بہت جلد افسردہ ہو گیا کیونکہ اس نے ضرورت سے زیادہ خوشبو اور درخشانی صرف کردی تھی۔ یہ گویا ایک طلسمی خواب تھا جس کی مختصر سی فرصت میں ہندوستان کے تمام جذبات نفسانی، عجم کے تمام سلیقے اور تکلفات، چین کا تمام بطی السیر سائنس اور عرب کے تمام شاندار پرستانی خواب شامل ہوگئے تھے۔

عرب کے ریگستانوں سے لیکر جزائر جاپان تک اور مغرب اقصیٰ سے لیکر ہندوستان تک عجمی مصوری کے خزانوں کو لئے ہوئے ایرانی نقاشی ایک بحر عمیق کے مانند ہے جو تمام خواہشات نفسانی، جملہ کیفیات نشہ و سرور اور قدیم اقوام و ملل کی تمام آزاد و موثر خیال آرائیوں کا معجون مرکب ہے۔ وہ ایک باغ عدن تھا جہاں پھولوں بھرے مرغزاروں میں شیر پھرتے تھے۔ جہاں سبز سرخ اور نیلگوں ریشمی پوشاکوں میں مرد و عورت

کے نقوش قالینوں پر نظر آتے تھے۔ عجمیوں کے لئے توجسقدر بھی پھول ہوں اتنے ہی کم ہیں۔ تمام پتوں میں پھول ہیں۔ تمام قالینوں میں پھول ہیں۔ جہاں دیکھو وہاں پھول ہی پھول ہیں۔ بڑے بڑے پھول جن کے نقوش ان کاسہ ہائے چینی میں بھی موجود ہیں جن میں خواتین عجم طلائی چمچوں سے قند و گل کھایا کرتے تھے۔ میدانی مناظر کی تصاویر میں جہاں سُرخ، سبز اور سنہرے رنگ ایسی قدرتی ہم آہنگی پیدا کردیتے ہیں کہ فرش تصویر پر نرم فرش مخلیں کا گمان ہوتا ہے شوخ و طناز خوبصورت راہوار گردنیں خم کئے سرپٹ دوڑتے نظر آتے ہیں۔ ہر مرکب پر ایک صاحب فخر و ناز راکب سوار ہے۔ کلائی پر ایک باز ہے اور ایک درخشاں طرۂ دستار ہوا میں لہرا رہا ہے۔ محلات و قصور کے جلوخانے فرط گل و ریاحین سے مشجّر بنے ہوئے ہیں۔ ان کی روغنی ابردار دیواروں پر جواہرات جڑے ہوئے ہیں۔ ان کی چھتیں بلوریں ہیں فرش رنگین قالینوں کا ہے، جہاں طلائی طاؤس اپنی زمردیں دُمیں پھیلائے ہوئے ہیں۔ باغات ہیں جن میں جگہ جگہ سنگ سماق اور سنگ یشب کے گملے نصب ہیں۔ آب شفاف کے فوارے ہیں جو فضا میں موتی اُچھال رہے۔ درجہ بدرجہ پشتے ہیں، خیابانیں ہیں۔ اور بروج ہیں جن کے رنگ گلابی، آسمانی یا دودھیا ہیں۔ شب کی تاریک گہرائیوں میں بھی یہ ایسے چمکتے ہیں جیسے طلوع آفتاب کے وقت برف۔ جب شام ہوتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک طائفۂ ارباب نشاط کنار آب بیٹھا ہوا نغمہ و سرود میں مصروف ہے، پختہ پھلوں کی فرحت بخش خوشبوئیں دماغ میں پہونچتی ہیں جو درختوں میں پتوں کے اندر چھپے ہوئے چمکتے ہیں اور نکلتا ہوا چاند تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ستاروں کے ہار سے کوئی سچا موتی ٹوٹ کر گرا ہے......

یہ تمام دلفریب مناظر موئے قلم سے کھینچے گئے ہیں اور ان میں چمکدار رنگ بھرے گئے ہیں۔ ان میں تاریک رات کی معصومیت اور دن کی روشنی موجود ہے۔ یہاں الف لیلہ کے تمام وہ قصے موجود ہیں جو داستان گویان باستانی کے خواب و خیال میں آئے تھے۔ اور جنھیں وہ شام سے صبح تک خیمہ کے نیچے حلقہ جما کر بیٹھے ہوئے خوشمزاج مسافروں کو سنایا کرتے تھے۔

یہاں عجیب و غریب قومیں ہیں جو بحیثیت مجموعی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ بعض وہ ہیں جو پشمینہ کی سفید عباؤں اور چغوں کے نیچے سرخ و سبز ریشم کی پوشاکیں پہنتے ہیں اور جو اپنے گھوڑوں کے ساز کو زرد جواہر سے مزین کرتے ہیں۔ یہ لوگ اسلحہ بناتے ہیں اور ان میں جواہرات جڑتے ہیں۔ وہ ابردار اور منقش ظروف مسی میں اپنا پانی رکھتے ہیں۔ ان کو صرف خاموشی و سکوت میں غور و خوض کرنا آتا ہے اور جو کبھی ہنسنے پر آتے ہیں تو قہقہوں سے آسمان سر پر اُٹھا لیتے ہیں۔ اور جو کبھی کھانے پینے کا دور آتا ہے تو نوشانوش میں

اپنی فطری متانت و سنجیدگی کو بھی بالائے طاق رکھدیتے ہیں۔ ان کو نہ موت کی پرواہے نہ زندگی کی فکر۔ ان کے استغراق و تصور کی بہشت میں حوریں آباد ہیں۔ ان کے شدید جوش مذہبی کا سوائے ان کی سخت کاہلی اور جمود کے اور کوئی چیز مقابلہ نہیں کرسکتی۔ وقت ان کے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا۔ اور وہ اپنے معابد کو اسی لاپروائی سے منہدم ہوجانے دیتے ہیں جسقدر جوش و خروش سے انھوں نے ان کو تعمیر کیا تھا۔

موسم کی شدتوں، فطرتوں کے زبردست تضاد اور بدویانہ زندگی نے ان کو توازن روحی سے جس کو ہم اس قدر عزیز رکھتے ہیں بے پرواہ کردیا ہے۔ دولتمند آدمی سو سو عورتیں رکھ سکتا ہے مفلس و نادار کے پاس چاہے ایک بھی نہ ہو۔ اس طرح گویا نفسیاتی تجرید اور بدترین بہیمیت کے مابین ایک زبردست فصل ہے جو کبھی پُر نہیں ہوسکتا۔ لیکن مغربی قومیں اس خلا کو اس طرح پُر کرلیتی ہیں کہ وہ ان تمام شاہراہوں کو طے کرجاتی ہیں جنہیں بہیمانہ زندگی سے آگے بڑھ کر شجاعانہ زندگی کی منزل تک پہونچنا لازم ہے۔ ان مغربی اقوام میں ہمکو وہ مشرقی قومیں بھی شمار کرلینا چاہئے جو بلحاظ نسل اسی جماعت سے تعلق رکھتی ہیں جس سے یوروپین قومیں متعلق ہیں۔

بیشک یہی وجہ ہے کہ ایرانیوں نے جن کے ذہن غالباً اسقدر وسیع نہیں تھے جتنے سامی النسل قوموں کے اپنے تاریخی کارناموں سے کبھی انحراف نہ کیا اور ہمیشہ ارض النہرین کے قدیم تمدنوں کا کچھ نہ کچھ اثر مستقبل میں پیدا کرتے رہے۔ اور غالباً یہی وجہ تھی کہ ساسانی اور اسلامی ایران کے درمیان فنون عجم کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اس میں شک نہیں کہ ایک روحانی مذہب بغیر بت پرستی کے ہی کام چلاسکتا ہے اور بجائے بتوں کو ترقی دینے کے معصوم روح کو ترقی دینا بہتر ہے مگر بت شکن شہنشاہوں کی حمایت میں جو یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ اگر تصاویر کا تعلق مذہب سے نہیں تھا تو فنون لطیفہ کا تو تھا اور وہ ان کو ترقی دیا کرتے تھے۔ بہت کمزور ہے۔ کیونکہ فن کو فن کے لحاظ سے اختیار کرنا چاہئے اور اس کو اس امر کا پابند کرنا کہ وہ ایک ہی سرچشمہ سے سیراب ہو ایسا ہے جیسے تمام سرچشموں کا پانی دفعتاً خشک کردیا جائے۔

اگر بت پرستی بائزنطیم کو نہیں بچاسکی تو اس کا باعث یہ تھا کہ بائزنطیم شجر یونان کا ایک سڑا ہوا پھل تھا۔ مگر وہ بت پرستی ہی تھی جس نے مصر و یونان اور ہندوستان کو بنادیا، جس نے قوم قوط کے انقلاب سیاسی کی زنجیریں کھول دیں۔ اطالیہ اور فلینڈرس میں دور بیداری پیدا کردیا اور جو یوروپ میں تمام گزشتہ صدی کے قابل تعریف اور اہم دور تحقیق و تدقیق کو وجود میں لائی۔ تمام پائدار تمدن بت پرستی ہی کے بطن سے پیدا ہوئے اور یہ مطالبہ ہرگز درست نہیں ہوسکتا کہ انسان ہمیشہ ریگستان میں رہا کرے جبکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خود ریگستان کے لوگ نخلستانوں

کی پناہ تلاش کرتے ہیں۔

یہ خیال درست نہیں کہ بت پرست قوموں نے خود کو اصنام پرستی سے آزاد کر لیا تھا بلکہ فی الحقیقت انھوں نے بت پرستی ہی کے ذریعہ سے نجات حاصل کی تھی، یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے اصنام پرستی کے ذریعہ سے دنیا میں مقولات کا سلسلہ جاری کیا۔ کیونکہ وہ تجزیہ و تحلیل کا ایک بے نظیر ذریعہ تھا۔ جو لوگ سوائے روح کے اور کسی چیز کو تسلیم نہیں کرتے وہ بھی اپنے آپ کو نفسیاتی بتوں سے علحدہ نہیں کر سکے۔ اور اس لئے یہ کہنا کہ انھوں نے بت پرستی نہیں کی غلط ہے۔

بت سازی خیال انسانی کے لئے ایک سہارا ہے اور یہ سہارا اس خیال کو حدودِ حقیقت کے اندر قائم رکھتا ہے، اور اسی کے ساتھ تخیل انسانی میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ بت پرستی تجربہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور اس کے ذریعہ سے عمل کی طرف لے جاتی ہے۔ جب ہمارا توازن متزلزل ہو جاتا ہے تو ہم بتوں کی طرف رجوع کرتے ہیں اور ان سے دعائیں مانگتے ہیں کہ وہ ہم کو نظم و ضابطہ سکھائیں تاکہ ہم پھر از سر نو زندہ ہو جائیں اور جب صحرا میں پیدا ہونے والے انبیا و رسل کا بتایا ہوا خیال گرد و غبار کے سوا کچھ باقی نہ رہیگا تو اسوقت بت پرستی ہی دنیا کو بچائے گی۔

نگار کے گزشتہ سالوں کے پرچے

حسب ذیل قیمت پر معہ محصول مل سکتے ہیں

ستمبر ۲۲ء ۴ر - اکتوبر ۴ر - جنوری ۲۴ء ۴ر - فروری ۴ر - مارچ ۴ر - اپریل ۶ر - مئی ۸ر - اگست ۴ر
جنوری ۲۶ء ۴ر - مئی ۴ر - جون ۴ر - اکتوبر ۴ر - نومبر ۴ر - دسمبر عہ - مارچ ۲۷ء ۴ر - اپریل ۴ر - مئی ۴ر - جون ۴ر
دسمبر ۲۸ء ۸ر - فروری ۲۹ء ۸ر - مارچ ۸ر - جون ۸ر - مارچ ۳۰ء عہ - مئی ۴ر - ستمبر ۴ر - اکتوبر ۴ر - نومبر ۴ر - دسمبر ۴ر
مئی ۳۱ء عہ - جولائی ۳ر - اگست ۳ر - ستمبر ۴ر - اکتوبر ۳ر - نومبر ۳ر - دسمبر ۳ر - جنوری ۳۲ء ۱۲ر - فروری ۴ر
مارچ ۴ر - اپریل ۱ر - مئی ۴ر - جون ۴ر - جولائی ۴ر - اگست ۴ر - ستمبر ۴ر - اکتوبر ۴ر - نومبر ۴ر - دسمبر ۴ر - جنوری ۳۳ء عہ
فروری ۴ر - جولائی ۴ر - اگست عہ - ستمبر ۱ر - اکتوبر ۴ر - دسمبر ۴ر -

منیجر نگار - لکھنؤ

تمہارا مسلک اور میرا مسلک

Commanders

تمہارا مسلک ایک آہنی درخت ہے جو اپنی غذا تقلید کی مٹی سے حاصل کرتا ہے اور جس کی شاخیں عادت و استمرار کی قوت سے نشو و نما پاتی ہیں۔

میرا مسلک ایک بادل ہے جو فضا میں آزادانہ تیرتا ہے، پانی بن کر برستا ہے، نہر و دریا بن کر سمندر میں مل جاتا ہے اور پھر کہر بن کر ہر طرف چھا جاتا ہے۔

تمہارا مسلک، ایک مضبوط برج ہے جس کو نہ آندھیاں جنبش میں لاسکتی ہیں اور نہ زلزلہ۔

میرا مسلک، ایک نرم و نازک درخت ہے جو ہر طرف جھک جاتا ہے اور جس کی لچک مسرت و سرور پیدا کرتی ہے۔

تمہارا مسلک، تمہارا قدیم مذہب ہے جو نہ تم میں کوئی تغیر پیدا کرسکتا ہے نہ اپنے اندر اور میرا مسلک میری بدعت و اختراع ہے جس کی چھان بین میں ہر صبح و شام کرتا رہتا ہوں۔

تمہارا مسلک یہ ہے کہ تمہارا قوی تمہارے ضعیف کو ہلاک کردے، تمہارا پُرفن فرد ایک سیدھے سادے شخص کو تباہ و برباد کردے۔

میرا مسلک یہ ہے کہ میں اپنے کھیت خود کاشت کروں اور خود انھیں کاٹوں، خود اپنا مکان تعمیر کروں اور اپنے کپڑے خود بُنوں۔

تمہارا مسلک جاہ و ثروت کا حصول ہے اور میرا مسلک اعتماد نفس،

تمہارا مسلک شہرت و نمائش کی جستجو ہے اور میرا مسلک یہ ہے کہ ان دونوں کو ساحل ابدیت پر ذرہ ریگ سے زیادہ وقعت نہ دوں۔

تمھارا مسلک، سلطنت و ملوکیت کے لئے کوشش کرنا ہے اور میرا مسلک ملک و وطن کے لئے استقلال حریت طلب کرنا۔

تمھارا مسلک یہ ہے کہ رات دن دیبا و حریر کا خواب دیکھا کرو اور میرا مسلک صرف روح کی پاکیزگی چاہتا ہے خواہ جسم عُریاں ہو۔

تمھارا مسلک یہ ہے کہ بڑے بڑے وظایف وخطابات حاصل کرو اور میرا مسلک قوم کی خدمت کرنا ہے۔

تمھارا مسلک یہ ہے کہ اجتماعی قانون، دینی قاموس، اور سیاسی مطولات مرتب کرتے رہو اور میرا مسلک مبادیات قلب و روح کو پیش کرنا ہے تمھارا مسلک کہتا ہے کہ فلاں عورت جمیل ہے، فلاں قبیح، فلاں فاضل ہے اور فلاں جاہل لیکن میرا مسلک کہتا ہے کہ "ہر عورت ہر مرد کی ماں ہے، ہر عورت ہر مرد کی بہن ہے اور ہر عورت ہر مرد کی بیٹی"

تمھارا مسلک بتاتا ہے کہ "فلاں چور ہے، مجرم ہے، قاتل ہے، سرکش ہے"

میرا مسلک کہتا ہے کہ "چور، سرمایہ داری کی پیداوار ہے، مجرم کا خالق خود ظلم ہے قاتل، مقتول کا حلیف ہے، اور سرکشی نتیجہ ہے قدامت پرستی کا"

تمھارا مسلک "ماہر و فیلسوف کا متجسس ہے، عالم و فاضل کی جستجو میں مبتلا ہے"

میرا مسلک "ایک محبت کرنے والے دل، ایک مخلص دماغ اور قربانی کرنے والی ہستی کا تمنائی ہے۔

تمھارا مسلک کہتا ہے کہ "فلاں موسوی ہے، فلاں عیسوی، یہ ہندو ہے، وہ مسلمان"

میرا مسلک کہتا ہے کہ "دنیا میں صرف ایک ہی مذہب ہے، مجردو مطلق -- اور اسی کی یہ سب شاخیں ہیں جن میں کوئی فرق نہیں"

تمھارا مسلک "کافر و مشرک فاسق و زندیق، شیعی و خارجی" کی چھان بین میں مصروف ہے اور میرا مسلک "ضعیف و کمزور، بیکار و مفلس، مجروح و معذور کی خدمت میں منہمک ہے۔

تمہارا مسلک غنی و فقیر، آقا و غلام کی تفریق کا حامی ہے اور میرا مسلک بتاتا ہے کہ ہم سب فقیر ہیں اور غنی صرف حیات ہے، ہم سب سایل ہیں اور صاحب عطا ہماری زندگی ہے۔

تمہارا مسلک بتاتا ہے کہ قوموں کی تشکیل سیاسی انجمنوں، سیاسی تقریروں اور سیاسی معاہدات سے ہوتی ہے اور میرے مسلک میں تعمیر قومیت صرف عمل سے ہوتی ہے۔

تمہارا مسلک کہتا ہے کہ "قوموں کا مجد و شرف اکابر ملوک سے وابستہ ہے اور سکندر و قیصر، ہنی بال و نپولین کا ذکر نہایت فخر کے ساتھ کرتے ہو۔

میرا مسلک کہتا ہے کہ " اکابر یہ نہیں ہیں بلکہ وہ کنفوشس و بودھ ہیں، افلاطون و سقراط ہیں، غزالی و رومی ہیں"

تمہارا مسلک کہتا ہے کہ قوت نام ہے تیغ و تفنگ کا، ہوائی جہازوں اور بحری اسطولوں کا، بم کا، زہریلی گیس کا۔

میرا مسلک کہتا ہے کہ قوت نام ہے حق و صداقت کا اور تیغ و تفنگ سے غالب آنے والے ایک دن مغلوب ہو کر رہیں گے۔

الغرض تمہارا مسلک اور ہے، میرا مسلک اور!

آیندہ جنوری ۳۵ء کا نگار

دہلی و لکھنؤ اسکول کی تمام اصناف شاعری پر ایک بے مثل بسیط تبصرہ ہوگا اور یہ کہنا غالباً مبالغہ نہ ہوگا کہ اس سے قبل آپ کو نہ کسی رسالہ میں نہ کسی بسوط تصنیف میں اتنا مفصل تذکرہ دونوں اسکولوں کی شاعری کا یکجا نظر آیا ہوگا ضخامت کے متعلق کوئی فیصلہ ابھی تک نہیں ہو سکا، کیونکہ تمام مضامین جو معیار پر صحیح اُتریں گے وہ سب کے سب درج کئے جائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ اس کا حجم سیکڑوں صفحات تک پہونچ جائے۔ اس ایک پرچہ کی قیمت علحدہ دو روپیہ سے کم نہ ہوگی، اس لئے آپ اپنی خریداری جاری رکھئے تاکہ یہ مجموعہ آپ کو بلا کسی مزید صرف کے مل سکے۔

مینیجر نگار لکھنؤ

نغمۂ دل

(گزشتہ سے پیوستہ)

لیکن ایک ایک شعر ارباب ذوق کو تڑپا دیتا ہے، اس اعجاز و اثر کا حقیقی راز صرف انداز بیان کی جدت و لطافت ہے، غرض شاعرانہ حیثیت سے انداز بیان اور طرز ادا کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اسکو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

جناب دل کے کلام میں یہ خصوصیت خاص طور پر نمایاں نظر آتی ہے، جس کا اندازہ ایک بڑی حد تک اِن اشعار سے بھی ہوتا ہے، جو ان کے محاسن معنوی کے سلسلۂ تنقید میں اوپر نقل ہوئے ہیں، اس موقع پر چند خاص مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ایک اسیر قفس کی زندگی جس مجبوری اور بیچارگی کے عالم میں گزرتی ہے، اس کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔

افسوس اک اسیر قفس کی تمام عمر
وقفِ نظر شناسی صیاد ہو گئی

"نظر شناسی صیاد" کی ترکیب نے ایک معمولی سے خیال کو جسقدر موثر اور دلکش بنا دیا ہے، اس کو ہر صاحب ذوق محسوس کر سکتا ہے۔

ناکامانِ زندگی جس طرح بہار کامرانی کی خیالی نقش آرائیوں سے اپنے افسردہ قلوب کو تسکین دیتے رہتے ہیں، اس کی کیفیت اس طرح بیان کرتے ہیں۔

بہلا رہے ہیں اپنی طبیعت خزاں نصیب
دامن پہ کھینچ کھینچ کے نقشہ بہار کا

محبوب کے دامن جھٹکنے کا انداز کوئی غیر معمولی خیال نہیں، لیکن جناب دل کا پیرایۂ بیان قابل داد ہے۔

سرِ طور ایک برقِ حسن لہراتی نظر آئی
ذرا شوخی سے جھٹکا تھا کسی نے اپنے داماں کو

جناب دلؔ اکثر تشریح کی بجائے اشاروں سے کام لیتے ہیں، جن سے طرزِ ادا میں ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے، یہ ان کا خاص انداز معلوم ہوتا ہے مثلاً

بیخودِ عشق ہیں دل مائلِ فریاد نہیں
ہم پہ گزرا تو بہت کچھ ہے مگر یاد نہیں

دیکھو "بہت کچھ" کے اشارے نے اور پھر اس پر "یاد نہیں" کے ٹکڑے نے جو دلکشی اور اثر پیدا کر دیا، وہ تشریح کی صورت میں ناممکن تھا۔

کہنے کی ہے کیا حاجت احوالِ شبِ فرقت
گزرا ہے جو کچھ ہم پر تم نے بھی سنا ہوگا

"تم نے بھی سُنا ہو گا" کے ٹکڑے نے ایک معمولی سی بات میں غور کرو، جان ڈال دی ہے، کہا کچھ بھی نہیں لیکن دراصل سب کچھ کہہ گئے۔

ہم کو بے چین کئے جاتے ہیں
ہائے کیا شے وہ لئے جاتے ہیں

بجائے "کیا شے" کے اگر صاف کہدیتے تو شعر کی تمام بلاغت برباد ہو جاتی، ابتدائے محبت کی غیر متعین کیفیت "ہائے کیا شے" نے جس خوبی کے ساتھ ادا کی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔

اگرچہ جناب دل کے اندازِ بیان میں کوئی غیر معمولی جدت اور ندرت موجود نہیں ہے، تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے طرزِ ادا میں ایک خاص روانی و برجستگی اور صفائی و دلآویزی عام طور پر محسوس ہوتی ہے، اس کا ایک خاص سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے جو زبان اختیار کی ہے وہ غزل کے لئے نہایت موزوں اور مناسب ہے، یعنی صاف، شیریں، سادہ اور تصنع و تکلف سے پاک ہے اگرچہ فارسیت سے بھی ذوق آشنا معلوم ہوتے ہیں، لیکن اس رمز سے واقف تھے کہ غزل کی لطافت ثقیل اور نامانوس فارسی ترکیبوں کی متحمل نہیں ہو سکتی، چنانچہ بجز ہلکی اور شیریں ترکیبوں کے ان کا کلام اس ثقالت سے پاک و صاف ہے، لیکن سادگی کے ساتھ ساتھ حتی الوسع شاعرانہ رنگینی کا بھی لحاظ رکھتے ہیں، اس کا اندازہ کافی طور پر اشعارِ مذکورۂ بالا سے ہر صاحبِ ذوق بآسانی کر سکتا ہے، مزید مثالوں کی چنداں ضرورت نہیں۔

غزل گو شعراء میں اکثر مسلسل واقعہ نگاری کی صلاحیت بہت کم ہوتی ہے، اور یہ اردو غزل گوئی کا ایک بڑا نقص ہے کہ باہم اشعار میں کوئی معنوی تعلق نہیں ہوتا، اگرچہ واقعہ نگاری اور تسلسلِ خیال کیلئے اور اصنافِ سخن مثلاً مثنوی، قصیدہ وغیرہ موجود ہیں تاہم غزل میں بھی تسلسلِ خیال سے کام لیا جائے تو

بہتر ہے، جنابِ دل کے کلام میں اکثر عشق و محبت کی مختلف کیفیات کی مسلسل مصوری کی مثالیں نظر آتی ہیں، جن سے ان کی قوتِ نظم کا اندازہ ہوتا ہے، مثلاً ابتدائے عشق کی ایک کیفیت مسلسل غزل میں بیان کی ہے، جس کا مطلع یہ ہے:-

یاد ہے اے ہمنشیں وہ بھی زمانہ یاد ہے   دل کا آنا یاد ہے پہلو سے جانا یاد ہے

ایک دوسری غزل میں جس کا مطلع یہ ہے

کسی کی یاد تھی آنکھوں سے اشک ڈھلتے تھے   اسی خیال میں ہم کروٹیں بدلتے تھے

محبوب کی یاد کی تصویر کھینچی ہے۔

اس سلسلہ میں وہ غزل جس میں جناب دل نے اپنا نذرانہ خلوص و عقیدت پیک یار کی معرفت بھیجا ہے خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہے، جس سے ان کے جوشِ محبت اور گرمی نیاز کا اندازہ ہوتا ہے اس غزل کا مطلع یہ ہے۔

شکیب و ضبط بھی اے پیکِ یار لیتا جا   پلٹ چلا ہے تو دل کا قرار لیتا جا

افسوس ہے کہ طوالت کے لحاظ سے ہم ان غزلوں کو مکمل نقل نہیں کر سکتے، ناظرین خود ملاحظہ فرمالیں۔

اِس مجموعہ کے آخر میں چند رباعیات اور مخمس ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب دل صرف غزلگو نہیں ہیں، بلکہ اور اصنافِ سخن پر بھی قادر ہیں، اور اپنے خیالات و جذبات کا اظہار نہایت روانی اور صفائی کے ساتھ مختلف طریقوں سے کر سکتے ہیں، چونکہ ان میں کوئی نمایاں خصوصیت نظر نہیں آتی، اور طوالت کا بھی خوف ہے، اس لئے ہم ان کو قلم انداز کرتے ہیں، اور جناب دل سے رخصت ہوتے ہوئے اتنا عرض کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ باوجود ان کے شاعرانہ فضل و کمال کے، باوجود ان کی متانت اور سنجیدگی کے باوجود ان کی اخلاقی بلندی اور پاکیزہ خیالی کے ان کی لکھنویت اب تک میری نگاہوں میں کھٹکتی ہے، جو ان کے عارضِ کمال کا ایک بدنما داغ ہے۔

مرزا احسان احمد (بی اے، ال ال بی)

مکتوبات نیاز

رعایتی قیمت میں وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں جو عار پیشگی بھیجدیں گے محض پیشگی نام لکھا لینا مفید نہیں ہو سکتا۔ منیجر نگار

استدراک جناب دل شاہجہانپوری

نغمۂ دل پر جناب نے اپنا قابل قدر وقت صرف کرکے جس فاضلانہ انداز سے ایک بسیط مضمون لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور پھر۔ کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ ۔۔ کو پیش نظر رکھکر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جو حقیقتاً کسی بحث پر مبنی نہیں ہے بلکہ صرف باہمی تبادلہ خیال کی حیثیت رکھتا ہے

جناب نے مقدمہ میں حضرت نیاز کے مقدمہ کی بابت تحریر فرمایا ہے کہ "ضرورت سے زیادہ طویل ہے"۔ میرے خیال میں جناب کا مدعا یہ ہے کہ مقدمہ میں صرف شاعر کے کلام یا اس کے حالات سے بحث کرنا چاہئے۔ اور شاعری پر گفتگو کرنا غیر ضروری طوالت ہے اگر واقعی مفہوم یہی ہے تو اکثر دواوین کے مقدمات نہ صرف طویل بلکہ لاطایل سمجھے جائیں گے اور اس حقیقت سے آپ ہی کو زیادہ واقف ہونا چاہئے۔ پھر جناب نے تحریر فرمایا ہے کہ غزلیات کی ترتیب قدیم طرز پر ردیف وار رکھی گئی ہے اس ترتیب میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ شاعر کے مدارج کلام کا صحیح طور پر اندازہ نہیں ہو سکتا یعنی ابتدا میں کلام کیسا تھا رفتہ رفتہ اس میں کیا ترقیاں یا تبدیلیاں ہوئیں، میرے محترم دوست، میں نے اس امتیاز کے لئے حرف قؔ اور جؔ لکھنا کافی سمجھا اس صورت میں اہل نظر کے لئے قدیم اور جدید کلام سمجھنے میں کوئی دقت باقی نہیں رہتی۔ کلام کے ردیف وار ہونے میں یہ زحمت پیش آتی ہے کہ اگر کسی غزل کے دیکھنے کی ضرورت ہو تو کل دیوان کی ورق گردانی ضروری ہو جاتی ہے۔ جناب تحریر فرماتے ہیں کہ "اگر ضخیم دواوین کے بجائے منتخب کلام کے مختصر مجموعے شائع کئے جائیں تو زیادہ مفید اور بہتر ہو۔ شاعر کا یہ کمال نہیں ہے کہ اس نے کتنا کہا بلکہ کیا کہا اور کیسا کہا"۔ جناب کے خیال سے اس قدر اتفاق مجھ کو ضرور ہے کہ پست اور عامیانہ اشعار ضرور خارج کر دئے جانے چاہئیں لیکن شدت کے ساتھ انتخاب مصنف کی قدرت سے باہر ہے ہر شعر مصنف کی عرق ریزی کا نتیجہ ہوتا ہے وہ اپنی

نظر میں اکثر کو بہتر سمجھتا ہے ایسی حالت میں یہ کام اس کے بس کا نہیں اگر کسی دوسرے نقاد کو یہ خدمت سپرد کی جائے تو دوم انتخاب اسی نقاد کے مذاق کا مجموعہ ہو جائے گا ہر سخن سنج کی پسند جدا ہے۔ دور گزشتہ کا ذکر ہے ایک مشاعرہ میں کسی شاعر کے کلام پر جناب غالب ایک شعر کو تین مرتبہ پڑھوا کر داد سخن دیتے ہیں، حکیم مومن خاں خاموش ہیں اسی غزل میں جب شاعر دوسرا شعر پڑھتا ہے جناب غالب خاموش ہو جاتے ہیں اور مومن خاں اس شعر کو کئی مرتبہ پڑھوا کر داد دیتے ہیں، میرے دیوان پر معارف میں مولوی عبدالسلام صاحب ندوی، تاج آگرہ میں جناب سیماب اکبر آبادی اور حمایت اسلام لاہور میں حضرت ریاض خیر آبادی جب اظہار خیال فرماتے ہوئے منتخب اشعار پیش کرتے ہیں تو ان میں سے اکثر ایک دوسرے کے انتخاب سے مختلف ہوتے ہیں۔ شوق سندیلوی نے اپنی سولہ غزلوں پر ستائیس مشاہیر سے اصلاح لی بعد ازاں اس کو اصلاح سخن کے نام سے چھپوا دیا آپ نے بھی اسے ملاحظہ فرمایا ہوگا، پھر کیا یہ امر حیرت انگیز نہیں کہ ایک استاد شعر کو قلم زد کر دیتا ہے اور دوسرا اسی شعر پر د صاد بنا تا ہے۔ یہ ہے اختلاف مذاق دنیاء شاعری کا اور یقیناً یہ سخت غلطی ہے کہ دیوان کسی ایک شخص کی رائے پر انتخاب کے بعد طبع کرایا جائے۔ بعض حضرات ایسے ہیں جن کے دل پر سرور انگیز تخیل اثر کرتی ہے، بعض یاس آفریں مضمون کو پسند کرتے ہیں کسی کے لئے نغمہ باعث دلکشی ہے اور کوئی نالہ وزاری پسند کرتا ہے، کہیں رنگ تصوف ہے اور کہیں فلسفہ۔ اگر دیوان صرف یاس آفریں خیالات کا مجموعہ بنا دیا جائے تو شگفتہ طبائع کی نظروں میں وہ کلام مرثیہ ہو جائے گا اور اگر نشاط انگیز کلام انتخاب کیا جائے تو صاحب درد کی نظروں میں بے کیف ہوگا۔ آگے بڑھ کر جناب تحریر فرماتے ہیں کہ "ماحول سے متاثر ہونا تقاضائے فطرت ہے جناب دل نے آنکھیں کھولیں تو ملک میں امیر مینائی کا رنگ چھایا ہوا تھا زانوئے تلمذ تہ کیا تو انھیں کے سامنے تہ کیا لیکن چونکہ قدرت کی طرف سے طبع سلیم عطا ہوئی تھی اس لئے ان کے کلام میں، وہ ابتذال نظر نہیں آتا جو عام طور پر لکھنؤ کا انداز ہے۔ تاہم لکھنویت کا اثر بہت کچھ نمایاں ہے نیاز صاحب نے ایک جگہ مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے غضب خدا کا آپ سارا دیوان پڑھ ڈالئے اور کہیں ایک جگہ بھی آپ کو وصل کا مبارک لفظ نہ ملے تمام مجموعہ چھان ڈالئے کہیں بھی اس آرام جان تمنا کا ذکر نہ آئے مجھکو جناب دل کی متانت اور سنجیدگی سے انکار نہیں لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس دعویٰ کا مقصد کیا ہے کیا اسکا یہ منشا ہے کہ جناب دل کا کلام لکھنویت سے بالکل پاک ہے، لکھنویت صرف وصل کا نام نہیں جو

مضامین عام طور پر لکھنؤ کے غزل گو شعراء کے سرمایہ خیال ہیں۔ مثلاً شمع تربت۔ چراغ مزار بت سفاک گریہ و زاری۔ ناز و ادا۔ کوچۂ قاتل۔ گور غریباں وغیرہ ان کی جھلک جناب دل کے کلام میں بھی نظر آتی ہے اور یہ اثر ان کی قدیم غزلوں میں محسوس ہوتا ہے" اس کے بعد آپ چند شعر نقل فرماتے ہیں اور اسکے بعد لکھتے ہیں کہ:۔

"اس قسم کے اور بھی اشعار ہیں جن کو طوالت کے لحاظ سے ہم قلم انداز کرتے ہیں دو شعر اور ملاحظہ ہوں"

ہوا سنکی گھٹا چھائی چمن میں پھر بہار آئی | تمنا ہے کہ وہ گل پیرہن پہلو نشیں ہوتا
یہ بھیگی رات یہ ٹھنڈا سماں یہ کیف بہار | یہ کوئی وقت ہے پہلو سے اُٹھ کے جانیکا

کیا نیاز صاحب اب بھی اپنے دعوے پر قائم ہیں کیا پہلے شعر میں آرام جان تمنا کا ذکر نہیں، دوسرے شعر کا مصرعہ ثانی اگر وصل نہیں تو پھر کس کیفیت کی طرف اشارہ کر رہا ہے" یہ صحیح ہے کہ میری شاعری نے ایک لکھنوی اُستاد کے آغوش میں تربیت پائی تاہم مجھ کو تغزل میں عریانی اور رنگ ناسخ پسند نہیں آیا ممکن ہے کہ جناب کو وہ رنگ محسوس ہوتا ہو جس کو آپ لکھنوی کہتے ہیں اس امر کا آپ کو خود اعتراف ہے کہ یہ رنگ قدیم غزلوں میں نمایاں ہے۔ منت پذیر ہوں کہ جناب نے مخلصانہ پیرایہ میں مجھ کو آگاہ کیا مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ الفاظ مذکورہ کے استعمال کو لکھنویت سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے جبکہ شعراء دہلی کے کلام میں بھی بکثرت یہ الفاظ منظوم نظر آتے ہیں۔ بہ نظر اختصار چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

اصغر۔ وہ مست ناز جو معجز نمائیاں نہ کرے | لحد کا پھول چراغ سر مزار نہ ہو
غالب۔ خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں | چراغ مردہ ہوں میں بے زباں گور غریباں کا
اصغر۔ محو ادا و ناز ہے یوں ہمہ تن نیاز ہے | پوچھ صنم پرست سے کیفیت نماز عشق
ذوق۔ تھا کوچۂ قاتل میں شہادت کا دفینہ | کھودا جو کنواں گنج شہیداں نکل آیا
" یارب ہو دلکی خیر کہ کچھ کر رہے ہیں آج | چشم و نگاہ عشوہ و ناز و ادا صلاح
" میں جو شہید ہوں لب خندان یار کا | کیا کیا چراغ ہنستا ہے میرے مزار کا
" جن کی نظر چڑھا ترا رخسار آتشیں | اُن کا چراغ گور نہ تا حشر گل ہوا
" ابکی دل لےلوں تو پھر اُس بت قاتل کو نہ دوں | جان دوں مال دوں ایمان دوں پر دل کو نہ دوں
" نہیں آتا نہ آئے رحم نے ذوق اس ستمگر کو | بلا سے خوش تو ہوتا ہے وہ میری آہ و زاری سے

میرے اشعار مذکورۂ بالا کی بابت اگر جناب یہ تحریر فرماتے کہ سطحی اور پامال ہیں تو ایک حد تک صحیح تھا لیکن شمع تربت چراغِ مزار اور کوچۂ قاتل کو بالکل لکھنوی چیز سمجھنا درست نہیں۔ فصحاء دہلی کے یہاں بکثرت اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ ہر لفظ کا استعمال اپنے محل پر متین اور بے محل استعمال ہونے پر خلافِ مذاق ہو جاتا ہے، میری رائے میں مجرد مستی اور رقص کا لفظ اردو تغزل میں پسندیدہ نہیں لفظ مستی لغت میں ہوشیاری کے مقابل اور دوسرے مذموم معنی کا حامل ہے اسی طرح رقص کا لفظ اکثر محل پر مطربۂ عشوہ گر کی تصویر پیش کر دیتا ہے جب وجد کا متین لفظ موجود ہے تو رقص کا لفظ بے محل کیوں استعمال کیا جائے یہ میرا خیال ہے اگر کوئی صاحب ان الفاظ کے استعمال کو پسند فرماتے ہیں تو ان کی رائے ہے لفظ وصل کے استعمال سے مجھ کو انکار نہیں بشرطیکہ جماع کے مفہوم پر نظم ہو۔ معذور ہوں کہ دنیائے شاعری میں مجھ کو صراحۃً اس مبارک لفظ کے استعمال کا موقع نہیں ملا، میں وصل سے نا آشنا ہوں، ہمیشہ مہجور رہا ہر شاعر کو اپنی بیتی کہنا چاہئے مجھ کو انبساطی مضمون نظم کرنے کا کم موقع ملا اکثر فریادِ عاشقانہ جو مرثیہ کی حد تک نہ پہونچے میرا انداز ہے میرے محبوب کی بارگاہ میں رقیب کا بھی گزر نہیں گلۂ رقیب سے بھی نا آشنا ہوں میرے دو شعر نقل فرما کر جناب نے اظہار خیال فرمایا ہے، کہ اگر وصل نہیں تو کس کیفیت کی طرف اشارہ ہے۔ جناب نیاز نے اپنے مقدمہ میں لفظ وصل پر اظہار خیال فرمایا ہے مفہوم وصل کی بابت کوئی تذکرہ نہیں کیا صفحہ پانچ میں جناب نے تحریر فرمایا ہے "لیکن باوجود اسکے ہمکو جناب دلؔ کے کلام میں ایک خاص کمی محسوس ہوتی ہے یعنی رقص و سرود اور جوش و مستی کا عنصر بہت کم نظر آتا ہے جو عشق کی اصلی امتیازی خصوصیت ہے" یہ صحیح ہے کہ میرے کلام میں سرور انگیز مضامین کم ہیں لیکن مجبور ہوں کہ میں نے فضاء شاعری میں اکثر نالہ کشی کی کبھی انبساط کا موقع ملا تو حالتِ وجد طاری ہوئی، رقص سے نا آشنا ہوں اسی طرح خمخانۂ محبت میں بدمستی سے بھی بے خبر ہوں، اگر گستاخی نہ سمجھی جائے تو عرض کروں کہ جناب نے عشق کی اصلی امتیازی خصوصیت سرور رقص جوش و مستی کیوں قرار دی ہے عشق کی تعریف ملاحظہ ہو:۔ "عشق۔ بسیار دوست داشتن چیزے۔ نزد بعض اطباء مرضیت از قسم جنوں کہ از دیدن صورت حسین پیدا میشود عبدالرزاق شارح ظہوری از شرح اسباب و فتوحات الحکم نقل کردہ است کہ عشق ماخوذ است از عشقہ و آں نباتے ست کہ ازا اسلاب گویند چوں بر درختے پیچد آن را خشک کند۔ ہمیں حالت عشق است بر ہر دلے۔ کہ طاری شود جسم را زرد کند"۔ یہ تعریف رقص و سرور کے منافی ہے۔ اہلِ لغت کی تعریف سے قطع نظر کیجئے، کامیاب عاشق ضرور رقص و سرور کا

شید انظر آئے گا اور بہجور پیکر غم۔ تغزل صحیح کو جس حد تک میں سمجھا ہوں یہ ہے کہ تخیل شاعر مضامین مجاز میں عُریاں نظر نہ آئے، محاکات تصوف اور وہ فلسفہ جس کو تغزل برداشت کرے نظم کرنا چاہیئے۔

جس رنگ کو جناب نے لکھنوی خیال فرمایا ہے اس کی جانچ کے لیئے آیئے دیکھیں تو یہی شعراء دہلی کے کے یہاں بھی مثالیں ملتی ہیں یا نہیں سب سے پہلے خواجہ میر درد کے دیوان پر نظر پڑتی ہے جن کا مذاق شاعری متانت سے لبریز اور ابتذال سے پاک سمجھا جاتا ہے فرماتے ہیں:-

کبھو جو رخ دیکھا تو سواری کے نہیں قابل — مہ نو سے ہے پیدا عیب اسکی بدرکابی کا

دل اُس مژہ سے رکھیو نہ تو چشم راستی — اے بے خبر برا ہے یہ فرقہ سپاہ کا

جوں چاہیئے اس طرح بیاں ہم سے نہو گا — کر اپنے دہن ہی سے تو وصف اپنی کمر کا

میرے بھی طرف تو کبھی آجا مرے یوسف — بڑھیا کی طرح میں بھی خریدار ہوں تیرا

کرے کیا فائدہ ناچیز کو تقلید اچھوں کی — کہ جم جانے سے کچھ اولا تو گوہر ہو نہیں سکتا

دیکھ کر حال پریشاں عاشقان زار کا — بانکے معشوقوں نے رسم زلف اب دی ہے اٹھا

وہ مو کمر کہیں یہ ہو بے حجاب رات — تھا مثل زلف دل کو عجب پیچ تاب رات

گر کھینچے کھینچے چلتے جان اپنی شیخ کھوئے — کوئی زندہ دل کرے ہے اس مردہ شو بیعت

تارنگہ یہ دل یاں دونوں طرف سے دوڑے — دو ونٹ مقابل آئیں جس طرح ریسماں پر

اگرچہ دختر رز کے ہے محتسب درپے — جو ہو سو ہو پر اسے اب تو یار کہتے ہیں

اگر تجھسے ملئے کبھو عیب کیا ہے — نہ بد وضع تو ہے نہ بدکار ہیں ہم لوگ

اے رگ ابر یہ مژگاں بھی اگر ٹک برسیں — ایک پل میں کئی تالاب تو بھر جاتے ہیں

اگر میں نکتہ رسی سے ترا دہاں پاؤں — کمر کو چاہوں تو اسکے تئیں کہاں پاؤں

دور ہوں آمادہ میخوارگی یہ مے پرست — سر اگر کاٹے انھوں کا محتسب مثل کدو

داشتہ کبھی تو درد کے بھی ساتھ چاہیئے — بند قبا سے کھولئے اے گلبدن گرہ

گر مسیحا نفسی سے یہی مطرب تو خیر — جی ہی جاتے ہیں چلے تیری ہر اک تان کے ساتھ

جیتا کسی کو چھوڑے نہ یہ گانٹھ زہر کی — زلف سیہ وہ سانپ ہے جسکا ہے من گرہ

کبکہا آتش کیا کرے یوں قہقہے — چیونٹیوں کے گھر سدا ماتم رہے

شبخون کے لئے فلک پھرے ہے — کھینچے ہوئے تیغ کہکشاں سے
بدنام کرے ہے دختر رز — تیغ اس کو نکال اپنے یاں سے
مشتاق اگر ترا کچھ لکھتے تو کیا عجب ہے — ہوں مثل نرگس آنکھیں پیدا ابھی قلم سے
کچھ اور رنج و غم کے سوا سوجھتا نہیں — آتا ہے جبکہ یاد وہ کنج دہاں مجھے
کیوں تیغ تری دشمنی رکھتی ہے میرے ساتھ — مجھ کو تو نہیں کام کسی کی بھی کمر سے
کیا جانئے کس کس کے تئیں آہ ڈسیں گی — زلفوں نے تو بیطرح یہ اب چھوڑے ہیں کالے
یا تو وہ راتیں تھیں یا اب یہ دنوں کا پھیر ہے — ہاتھ اب لگتے نہیں تب پاؤں دبوایا کئے
وہ دختر رز کہ حیلتی پھرے اک جہان کو — سنتے ہیں درد باس بھی اک رات رکھی
تو چونکتا عبث ہے کسی بات کے لئے — میں آگیا ہوں صرف ملاقات کے لئے
دنیا وہ فاحشہ ہے کسی سے نہیں بچی — دیکھا جسے تو اس کے یہ مردار ساتھ ہے
نہیں ہے بے سبب یہ خندۂ دنداں نما ترا — کسی کے تو لہو پینے پہ یعنی دانت رکھتا ہے
زبس درد جدائی نے ترے بند دنکو مارا ہے — اگر آزار بھی ہوتا ہے تو وجع مفاصل ہے

اب فرمائیے یہ وہی مذاق ہے یا نہیں جس کو آپ لکھنوی مذاق کہتے ہیں اچھا اب جناب ذوق دہلوی کے کلام پر بھی نظر ڈالی جائے جن کے دیوان کا بیشتر حصہ اسی مذاق میں ہے۔ مثلاً چند شعر پیش کئے جاتے ہیں

اس نزاکت پر نظر آتا کہ وہ رشک پری — بال بھی باندھے جو مسی پر تو زلف حور کا
دفن ہے جس جا پہ کشتہ سر دھڑی کا تری — بیشتر ہوتا ہے واں پیدا شجر کافور کا
دانت یوں چمکے ہنسی میں رات اس مہ پارہ کے — میں نے جانا ماہ تاباں پارہ پارہ ہوگیا
دکھلائے ذوق ہونگے آج واں لاکھوں کے خون — پھر جمایا اس نے لعل لب پہ لاکھا پان کا
ترے جوڑے کے کھلنے نے مرا دل استاں ٹھا باندھا — عجب تقدیر نے عقدۂ دہاں کھولا یہاں باندھا
اس لعل لب کے بوسے لئے ہمنے اسقدر — سب اڑ گئی مسی کی دھڑی دو دھڑی کے بعد
طفل اشک ایسا گرا دامان مژگاں چھوڑ کر — پھر نہ اٹھا کوچۂ چاک گریباں چھوڑ کر
صید دل کو کیونکہ چھوڑے جبکہ دکھلائے ہو تو — مچھلیاں دست حنائی میں مری جاں چھوڑ کر
سرخئ پان دیکھ لے زاہد جو دنداں پر ترے — اٹھ کھڑا ہو ہاتھ سے تسبیح مرجاں چھوڑ کر

تیرے دندان مسی زیب کی دیکھی جو بہار
یہ جتنے سرو ہیں سب اسکے قد پر زہر کھاتے ہیں
تاب دنداں نہ دکھا بزم میں تو ہنس ہنس کر
کس نزاکت سے ہے دیکھو اتحادِ حسن و عشق
دنبالہ سے سرمہ کے دھواں ہیں تری آنکھیں
خال سرمہ کا تمھیں چاہئے زیبایش کو
تم مسی ملکر نہ غرفہ سے نکالا منھ کرو
جب دیکھے اسکو تھام کے دل بیٹھ جائے ذوق
جوں پنجِ شاخ تو نہ چلا انگلیاں طبیب
کھائے داغِ آتشیں رخسار سے
اسنے مارا رخِ روشن کی دکھا تاب مجھے
کشتہ ہوں میں کس چشم سیہ مست کا یارب
نہیں مژگاں کی دو صفیں گویا
لیتے ہیں شبِ وصل میں ہم اُن کے جو بوسے
چنی تو نے افشاں جو اے مہ جبیں ہے
آتشِ خورشید سے دیکھا نہیں اٹھتے دھواں
نعل شکل مہ نو جب ترے توسن کو لگے
بعد مُردن بھی خیالِ چشمِ فتاں ہی رہا
تو آنکھ میں نہ سرمۂ دنبالہ دار دے
چھلا نہیں تو چھلے کا گل اے نگار دے
ہزار دم ہیں اسے یاد تو نے دیکھا ذوق
کرتی ہے زیر برقعِ فانوس تاک جھانک
پہونچا تھا شب کمند لگا کر وہاں رقیب

اودس سی پڑ گئی گلشن میں گلِ سوسن پر
چمن میں سبز کیونکر ہو نہ جائیں سر سے پاؤں تک
کوئی کھا جائے نہ ہیرے کی کنی خوب نہیں
زلف واں شانے پہ لٹکی در دہیاں شانے میں
کہ بیٹھیں نہ کچھ سیف زباں ہیں تری آنکھیں
اخترِ سوختہ ہے اپنا ہی زیبا ہم کو
اور نہیں گر مانتے ۔ تو جاؤ کالا منھ کرو
جب ناز سے کھڑا ہو وہ رکھ کر کمر پہ ہاتھ
رکھ رکھ کے نبضِ عاشقِ تفتہ جگر پہ ہاتھ
کم نہیں دل مرغِ آتش خوار سے
چاہئے بہر کفن چادرِ مہتاب مجھے
ٹپکے ہے جو مستی مری تربت کے شجر سے
اک بلا اک بلا سے لڑتی ہے
وہ لب پہ سحر رنگ مسی کو نہیں پاتے
ستاروں میں کیا کیا چناں اور چنیں ہے
آ کھڑے ہو بام پر تم بال سکھلاتے ہوئے
چار چاند اور فلک پر مہ روشن کو لگے
سبزۂ تربت مرا وقفِ غزالاں ہی رہا
مفتونِ چشم کو یہیں اک بار مار دے
کچھ تو نشانی اپنی مجھے یادگار دے
گیا وہ غیر کے گھر تجھ کو ٹال کے کیسا
پروانے سے ہے شمع مقرر لگی ہوئی
سچ ہے حرامزادے کی رسی دراز ہے

جناب غالبؔ جن کا دیوان فلسفۂ عشق اور جذبات سے لبریز ہے اور دھول دھپا تک پہونچکر خود ہی پیش دستی کرنے لگے ہیں فرماتے ہیں:-

پینس پہ گزرتے ہیں جو کوچہ سے وہ میرے
کندہا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

مرزا داغؔ دہلوی کا کلام اکثر عریاں ہے بہ نظر اختصار صرف ایک شعر پیش کرتا ہوں۔

حوروں کا انتظار کرے کون حشر تک
مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں

دور حاضر کے مشاہیر دہلی صرف زبان کے پھیر میں پڑے ہوئے ہیں بکثرت نمونہ کلام اس رنگ میں ہے جسکو جناب "لکھنوی" کہتے ہیں بہ نظر طوالت قطع نظر کرتا ہوں اب ہمارے مکرم جناب اصغرؔ گونڈوی کے کلام پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے اپنے منتخب دیوان میں فرماتے ہیں،

بکھری ہوئی ہو زلف بھی اس چشم مست پر
ہلکا سا ابر بھی سر میخانہ چاہیے

اس رخ رنگیں سے آنکھیں سینکئے
ڈھونڈیے اب آتش ایمن کہاں

زاہد سادہ لوح کو وہم تھا اشتباہ تھا
مصحف رخ سے حل ہوا مسئلۂ جواز عشق

جلوۂ رنگیں اتر آیا نگاہ شوق میں،
ہم لطافت جسم کی اے سیمتن دیکھا کئے

نقش قدم رہیں اسی جان بہار کے
اک پنکھڑی پڑی ہے لحد پر گلاب کی

سب مزے کردئے خورشید قیامت نے خراب
میری آنکھوں میں تھا وہ روئے دلآرام ابھی

ہستیٔ غیب سے گہوارۂ فطرت .....
خواب میں طفلک عالم ہے سراسر مدہوش

اے دل شوخ و حیلہ جو زیر کمین رنگ و بو
طائر قدس کو بھی دے دانۂ مجاز ہیں

جہاں بھی میری نگاہوں سے ہو چلا معدوم
ارے بڑا غضب اے چشم سحر کار کیا

موج نسیم صبح کے قربان جائیے
آئی ہے بوئے زلف معنبر لئے ہوئے

الغرض محض الفاظ نہ لکھنوی ہوتے ہیں نہ دہلوی، بلکہ ان کا محل استعمال لکھنوی وغیر لکھنوی شاعر کی خصوصیت کو ظاہر کرسکتا ہے بشرطیکہ پہلے یہ امر باور و تسلیم کرلیا جائے کہ لکھنؤ میں کوئی جذباتی شاعر پیدا ہی نہیں ہوا اور دہلی میں سوائے حقیقی عشق کرنے والوں کے کسی اور نے شاعری کی ہی نہیں ورنہ یوں تو جس طرح ابتدا سے امیر و میرزا کا کلام خالی نہیں بالکل اسی طرح ناسخ و پیروان ناسخ کے یہاں بھی صحیح عاشقانہ جذبات مل سکتے ہیں۔

حکیم ضمیر حسن خاں دلؔ شاہجہانپوری

موجودہ ترقی فقط ایک دھوکا ہے

افسوس ہے، کہ خوش اعتقاد لوگ، موجودہ زمانہ کی "ترقیٔ موہوم" سے مرعوب ہوکر، انسان کی موجودہ ترقی کا صحیح اندازہ لگانے سے بالکل قاصر ہیں۔ علم تمدن کا ہر ماہر، نہایت آسانی سے قطعی طور پر یہ ثابت کرسکتا ہے کہ مسئلۂ ارتقاء (Evolution) کو نظر انداز کربھی دیا جائے، تو صرف بہتر غذا، اچھا ماحول، اور عمدہ تعلیم و تربیت کی بناء پر، انسان کی موجودہ حالت بہت کچھ سدھاری جاسکتی ہے۔ وہ اپنی مدلّل گفتگو سے تمھیں اس بات کے ماننے پر مجبور کردے گا کہ "افراط و تفریط" "سرمایہ داری" اور "مزدوری" کے جھگڑوں کی وجہ صرف ایک ناقص اقتصادی اُصول ہے۔ وہ تم سے یہ بھی منوا چھوڑے گا کہ انسان باوجود "قصوروار" ہونے کے موجودہ زمانہ کی "منظم بے ترتیبی" (Ordered Disorder) سے اسی درجہ بری الذمہ ہے جسقدر ایک پتنگا (جو غیر ارادی طور سے شمع پر جل مرتا ہو) الزام خودکشی سے۔ وہ، بطور مشاہدہ، بیّن طریقہ سے تمھیں دکھادے گا کہ ایک بازی گر کی توانائی اور چستی اور ایک مفلوج شخص کی خمیدہ پیٹھ میں جو فرق ہے وہ مشروط ہے، نہ کہ فطری۔ اس کے علاوہ، علم معاشرت کا ماہر یہ بھی ثابت کر دکھائے گا کہ انسان کی مذموم ترین خصلت اور ناپسندیدہ ترین حرکت، "طبعزاد" یا "جبلّی" نہیں، بلکہ وہ ۔ نتائج ہیں اُن "مدافعانہ حملوں" کے جو ہماری "خود ساختہ سماجی پابندیاں" ہمارے فطری اوصاف پر کرتی رہتی ہیں۔

وہ شخص جو "انقلاب پسند" ہو، یا وہ شخص جو کھلے میدان میں لڑنے سے احتراز کرتا ہو، یا وہ شخص جو، خواہ مخواہ تلوار کے زور سے مذہب پھیلانے پر تلا ہوا ہو، یا وہ شخص جو گوشت کھانے سے پرہیز کرتا ہوا اور ہمیشہ نباتات ہی پر گزر کرتا ہو، ـــــ ڈاکٹر ہو یا وکیل، پادری ہو یا اُصولِ اخلاقیات کا معلم، ورزش میں طاق ہو یا سپاہی ہو، شکاری ہو، یا موجد، سیاست داں ہو یا......کوئی بھی ہو، ـــ سب کے سب ایک آدھ نسخہ انسان کی ترقی و بہبودی کے لئے پیش کرتے ہیں، اور تقریباً ان لوگوں کی ہر مجوزہ اصلاح، دائرۂ امکان کے اندر ہی

ہوتی ہے۔ اور ایک نہ ایک بُرائی کی بیخ کنی ہی کے لئے مخصوص ہوتی ہے.....لیکن ان لوگوں کے نظریہ کے مطابق "ترقی" کا معیار، ہر مجوزہ اصلاح کا عملی طور پر پورا ہو جانا، اور ہر فرد بشر کا "دماغی" اور "جسمانی" ترقی کے اُس بلند ترین کنگرہ پر پہونچ جانا ہے، جس پر بہت ہی تھوڑے لوگ اب تک بدقت تمام پہونچ سکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھیں، ایک مصلح کے "تگ و دو" کے لئے ایک وسیع اور لق و دق میدان نظر آتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انسان کے لئے بہت سی عظیم الشان منازل مقصود ہیں، جن کی دشوار گزار گھاٹیوں کے عبور کرنے کا شوق ہر اولوالعزم شخص کے دل میں موجزن ہے۔ اور اسی لئے انسان کے واسطے ترقی کا ہر دروازہ کھلا ہوا ہے!—— لیکن افسوس ہے کہ موجودہ انسانی نسل کا کوئی فرد بھی بام ترقی کے اُن سر بفلک چوٹیوں (جن کی جانب وہ روز ازل سے للچائی نگاہوں سے دیکھتا رہا ہے) کے گرد پا کو بھی نہ پا سکا!

تاہم، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ "اگر" ہم سب کے سب کمر ہمت باندھ کر اول الذکر مصلح کے بتائے ہوئے راستہ کو شروع سے آخر تک طے کر لیں، تو یقیناً دُنیا ترقی کے میدان میں بہت دور نکل جائے!...لیکن نہ تو یہ "اگر" امید افزا معلوم ہوتا ہے،..... نہ وہ "اگر" کہ "اگر آسمان گر پڑے تو چڑیاں پکڑ لوں!" سچ تو یہ ہے کہ انسان اُس بتائے ہوئے دشوار گزار راستہ پر کبھی گامزن نہوگا، اس کی ہمت اور قوت ارادی، اس کام کے لئے ناکافی ہے، اور وہ صحیح معنی میں ان مقاصد کے پورے ہونے کا سچے دل سے متمنی بھی نہیں ہے کیونکہ ہماری تمنائیں اکثر و بیشتر "سطحی خواہش سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔

تم اگر کسی سے یہ پوچھو کہ "کیا تو بہتر انسان بننا چاہتا ہے؟" تو وہ نہایت دیانتداری سے جواب میں "ہاں" کہیگا۔ یا تم اگر کسی سے یہ پوچھو کہ "تم ایک لاکھ روپیہ لوگے؟" تو وہ بھی بصد آرزو "ہاں" کہیگا۔ لیکن وہ دیانت دار انسان، جو ایک "بہتر انسان" بننا چاہتا ہے، اپنے سابق طرز عمل کی لکیریں اب تک پیٹتا نظر آتا ہے! اور وہ آوارہ گرد جو ایک لاکھ روپیہ کی تمنا رکھتا ہے، دس شلنگ بھی کمانے کی زحمت گوارا کرنا پسند نہیں کرتا! یہی وجہ ہے کہ بیشمار لوگ، جو تمام عمر لاکھوں روپیہ کی وراثت کے ملجانے کی اُمید پر زندگی کی گھڑیاں گنتے رہے، جب مرے تو اس طرح کہ کبھی پانچ پاؤنڈ بھی بیک وقت ان کے پاس جمع نہو سکا۔ اس سے انکار نہیں کہ ایسی مثالیں بھی ہیں کہ اکثر فقیر پھٹے پرانے اور بوسیدہ گودڑیوں میں دم توڑتے ہیں، لیکن ان کی جھولیاں اشرفیوں سے پُر ہوتی ہیں،.....جس کی وجہ صرف یہی ہے کہ اُن کی خواہش روپیہ کے جمع کرنے کی اسقدر زبردست ہوتی ہے کہ وہ اپنے ارادے میں کامیاب رہتے ہیں۔

علم اقتصادیات کا ماہر جانتا ہے کہ جب تک کسی چیز کی مانگ نہ ہو، اس کا مہیا ہونا ناممکن ہے - اور یہ مقولہ، سیاست، اخلاقیات اور زندگی کے ہر شعبہ کے لئے صادق آتا ہے. کسی چیز کا فراہم ہو جانا "طلب صادق" پر منحصر ہے - اس لئے محض تمناؤں کے ہجوم اور زبانی جمع خرچ سے کچھ بھی نہیں ہوتا. کسی قوم یا فرقہ نے ابتک تربیت گاہِ تمدن کی ابتدائی تعلیم اور تشکیل سے باہر قدم نہیں نکالا ہے ...... اور اس معمولی سی ترقی کے مدارج بھی، کسی "جذبہ رفاہ عام" کے ماتحت نہیں، بلکہ تعصبانہ ضد، اور وحشت بربریت کے ذریعہ سے طے ہوئے ہیں - انگلستان کے ۱۸۳۲ء کے ریفارم بل کو دیکھو..... کیا یہ اس امر کی تشریح نہیں کرتا کہ دو تعلیمیافتہ جماعت، ایک ایسے سیاسی اصلاح کے نافذ کئے جانے پر جس کی ضرورت بین اور ناگزیر ہو، آپس میں لڑمریں اور یہ مسودۂ قانون اس وقت تک "قانون" بنکر نافذ نہ کیا جا سکا، جب تک برمنگھم کے "شرفاء" نے سینٹ جیمس کے مذہبی حلقہ کے "شرفاء" کا، فوجی ساز و باز کے ساتھ گلا گھونٹنے کا انتظام نہ کر لیا - اور سچ تو یہ ہے کہ اس کا نفاذ ابتک نہ ہوا ہوتا اگر اس کے "مفاد" کے منطقی بحث و مباحثہ کے علاوہ، "طاقت" اور "زور" سے کام نہ لیا گیا ہوتا..... بلکہ الیزبتھ کی طرح ہوش گوش رکھنے والا خود مختار اور مطلق العناں حکمراں کالج کے اُن سن رسیدہ طلباء کی جماعت کثیر کی بہ نسبت (جو ۱۸۸۴ء کے قبل تک اپنے "قدیمی استحقاق" کی بنا پر حکومت کرتے چلے آتے تھے، اور جو ۱۸۸۴ء کے بعد سے، جب "حق رائے زنی" ہر بالغ شخص کو عطا ہوا کبھی بہتر طریقہ سے حکومت کرتا -

موجودہ زمانہ میں اُن فلسفیوں کی جگہ، جو ہر فعل کی اصلیت اور خوبی وہ اُس کے افادی نقطۂ نظر سے جانچتے تھے (Fabian Society) نے لے لی ہے - اس سوسائٹی کے شایستہ، باضابطہ اور سکون پسند طریق عمل کے قابل قبول ہو جانے کا واحد ذریعہ بس یہی ہے کہ ہر فرد بشر اس کے اصول پر ٹھنڈے دل سے غور کرے، سمجھے اور بے چون و چرا قبول کرے - لیکن آج (Fabians) کا نام اُنھیں مقامات میں جہاں آج سے تینتیس ۳۳ برس پہلے لفظ (Socialism) "قاتل" اور "فتنہ پرور" کے مرادف سمجھا جاتا تھا، کیوں اسقدر عزت سے لیا جاتا ہے؟ اس لئے نہیں کہ دُنیا کی سرمایہ دار حکومتوں کو اس سوسائٹی کے "حسن تدبیر" پر غور و خوض کرنے کا اور عمل پیرا ہونیکا ذرہ برابر بھی خیال ہو..... بلکہ اس لئے کہ انھوں نے اپنے "طریق عمل" سے تشدد، تہدید، اور استبداد کے عناصر کو نکال کر، مفلس اور قلاش عوام الناس کی "انقلاب پسند جماعت" کی صدائے احتجاج کا صرف قلع قمع ہی نہیں کر دیا بلکہ موجودہ نظام حکومت، اور طرز تمدن کو اس واحد خطرے سے، جس سے وہ حقیقتاً خائف تھے - بالکل بیفکر بنا دیا!

بلاشبہ اگر اقوام عالم، آج بھی (Fabians) کے طریق عمل پر کاربند ہو جائیں، تو اس کی پابندی اُتنی ہی سختی کے ساتھ برتی جائے گی، جس طرح، موجودہ زمانہ میں قوانین ملکیت کی۔ اور (Fabians) کا "اُصول" "عمل قانون" کی حیثیت اختیار کر لیگا اور اس کے مخالفین یا تو جرمانہ دینے پر مجبور کئے جائیں گے، یا کھڑے کھڑے فروخت کر دئے جائیں گے، یا بالآخر انھیں۔ جس طرح موجودہ قوانین کی عدول حکمی پر سزا ملتی ہے، ــــ پھانسی دیدی جائے گی۔

لیکن سر دست، سرمایہ دار طبقہ (Fabians) کے ان "اُصول" کو "قوانین" کی اہمیت حاصل کرتے ہوئے نہ دیکھ کر،...... ان سے خایف نہیں ہے۔ لیکن، برخلاف اس کے یہ طبقہ غارتگروں اور قاتلوں کی خفیہ سازشوں سے ڈرتا ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ یہ طبقہ حتی الامکان، اس حقیقت کو طشت از بام ہونے نہیں دیتا کہ بالآخر اُن ذرایع میں جو یہ (یعنی سرمایہ دار طبقہ) "حقوق ملکیت" (Proprietary rights) کے استحفاظ کے لئے استعمال کرتا ہے، اور اُن ذرایع میں جو ایک "بم انداز" (Bomb Thrower) اپنے ذاتی خیال کے مطابق انسان کے فطری اور پیدائشی حقوق کے استحفاظ کے لئے استعمال کرتا ہے ــــ جہاں تک اخلاقی فرائض کا سوال درپیش ہے ــــ کچھ بھی فرق نہیں۔

سرمایہ دار حکومت، (Fabian Society) کی پیٹھ "شاباش" کہکر ٹھوکتی ہے۔ برخلاف اس کے مساوات عامہ کا علمبردار (Socialists) ــــ جو کھلے الفاظ میں یہ کہدیتا ہے کہ مساوات عامہ کے حاصل کرنے کے لئے وہ انقلاب چاہئے جس میں "انقلاب پسند" جماعت مخالف جماعت کو جو ڈرانے، دھمکانے اور مارنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتی، "گمراہ کن" تصور کیا جاتا ہے۔ اور اُس کو قید سخت اور محنت شاقہ کی سزا شاید اس غرض سے دی جاتی ہے کہ سرمایہ دار حکومتوں کی "عدم تشدد دانہ لنترانیوں" کے پول کھل جائیں! اور ان قیدیوں کو معلوم ہو جائے کہ سرمایہ دار حکومتیں یوں لاکھ عدم تشدد کا سبق اپنی زبان سے رٹا کریں، اور دوسروں کو حفظ کروانے کی کوشش کیا کریں، لیکن جب کبھی ان کے نام و نمود کو ایک ہلکی سی ٹھیس بھی لگ جانے یا لگ جانے کا اندیشہ ہو، تو یہ (یعنی سرمایہ دار حکومتیں) فوراً "عدم تشدد" کے ازبر سبق کو دفتر پارینہ کا کرم خوردہ باب سمجھ کر صاف بھول جاتی ہیں اور پھر "تشدد" و "استبداد" کے حربوں سے کام لینے لگتی ہیں۔

تو کیا ہم "صلح جو" اور "سکون پسند" ذرائع کے توسل سے نسل انسانی کی ترقی کا خیال اُٹھا دیں؟ اور "بم اندازی" اور "خفیہ سازشوں" پر اُتر آئیں؟ ــــ نہیں ــــ یہ دونوں طریقے بیکار ہیں۔

لیکن، غالباً بم انداز کا یہ کہنا حق بجانب ہوگا "کیا تم نے ابھی ابھی اس کا اعتراف نہیں کیا ہے کہ کوئی چیز بغیر لاٹھی کے زور کے نہیں حاصل ہوتی؟ کیا (Gladstone) کو یہ تسلیم نہ کرنا پڑا تھا کہ (Irish Church) کی مخالفت توپ سے سر کی گئی نہ کہ غیر متعصبانہ جذبات (Libralism) کے اثر سے؟

ہم کو ان سوالات کا جواب بیوقوفی اور بزدلے پن سے "نفی" میں نہیں دینا چاہئے...... حقیقتاً "بم انداز" کے قول کا مجھے اعتراف ہے.... بلکہ یہ کہنا بھی صحیح ہوگا کہ فطرتِ انسانی کا تقاضا یہی ہے کہ اگر کسی مساداتِ عامہ کے سب سے زبردست حامی کے پاس کچھ اپنی ذاتی جائداد ہو تو اُس کا طرزِ عمل بھی قدیم زمینداروں سے — ہرگز جداگانہ نہو گا۔

غور سے دیکھا جائے تو پارلیمنٹ میں، "مخالفین کی صف بندی" کو "جنگ" پر صرف اسی قدر امتیاز حاصل ہے، جتنا ایک ایسی فوج کو (جو بغیر لڑے بھڑے ہتھیار ڈالدے) Waterloo اور Trafalgar پر! ——— میں ان مندرجہ بالا "اعترافاتِ حقیقت" کا ہدیہ

(۱) ان (Finnians) کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جنھوں نے سادہ لوح آئرلینڈ کے باشندوں سے — جو اُن کے مظالم سے تنگ آکر امریکہ میں پناہ گزیں ہوئے تھے — اس غرض سے روپیہ وصول کیا کہ اُنھیں کے پس ماندہ رشتہ داروں پر و نیز ان کے سیاسی و مذہبی عقائد پر آئرلینڈ پہونچ کر حملہ کیا جائے۔

(۲) و نیز اُن خفیہ پولیس حضرات کی خدمت میں جو سیدھے سادھے کم عمر مزدوروں کو بہکا کر، پاس ہی کے کسی لوہار کی دوکان سے "بم" لانے کو کہتے ہیں، اور بعدہٗ وہ اُنھیں گرفتار کر کے سزائے دائم الحبس دلواتے ہیں۔

(۳) و نیز اُن برّی، اور بحری سپہ سالاران فوج کی خدمت میں جو دشمنوں کے شرائط اور پیام صلح کو ٹھکرا کر ایک آخری "ناقابلِ قبول شرط التوائے جنگ" Ultimatum پیش کر کے گولہ اور بارود کے منھہ برسانے لگتے ہیں۔

لیکن کیا فائدہ کہ انسان بجائے "نرمی" اور "انسانیت" کے "سختی"، اور بجائے "غور و خوض" کے "جلد بازی" اور "ناعاقبت اندیشی" سے کام لے؟ کیا آج انگلینڈ آئرلینڈ کے قلعوں کے مسمار کر دئے جانے سے بہتر حالت میں ہے؟ یا کیا اس خیال کی ذرا سی بھی گنجایش ہے کہ ایک ایسی قوم کو جو بھیڑ بکریوں کی طرح

مظالم برداشت نہ کرے اور بعدہٗ چند ایسے مستقل مزاج مصلحین کی سرکردگی میں اُن تینوں اول الذکر اشخاص کے سروں کو قلم کردے اس انقلاب سے کچھ بھی فائدہ ہوا ہوگا۔

فرض کرو کہ (Gun powder plot) کامیاب ہوتا اور (Fawkes) کا خاندان ہمیشہ کیلئے تختِ شاہی پر جلوہ افروز ہو جاتا تو کیا اس ردوبدل سے انگلستان کی موجودہ قومی یا انفرادی حالت میں ذرہ برابر بھی فرق ہوتا؟ ...... نہیں۔

فرانس میں "مجرموں" کے سر کاٹنے کی مشینوں (Guillotine) کا استعمال انسانی تحمل اور برداشت کی حد سے زیادہ کیا گیا۔ اس لئے اگر (Marie antoinette Fouquier) کی طرح اپنے قاتلوں سے یہ پوچھتی کہ "کیا میرا سر قلم کرنے سے تمھیں روٹیاں سستے داموں ملیں گی؟" تو اسکا یہ سوال ہرگز بے محل نہ ہوتا...... فرانس کو اس خونریزی سے کیا ملا؟...... امریکہ ہی کی طرف دیکھو! یہ مانا کہ وہاں نہ تو (Star chamber) ہے، اور نہ ایسے جاگیردار ہیں جنھیں جاگیریں بشرط خدمات جنگ دی گئی ہوں۔ مگر امریکہ میں لکھ پتی اور کروڑ پتی ہیں جن کے کارخانجات برقی تار اور مسلح نوکروں سے گھرے ہوئے ہیں۔ کیا امریکہ کی "جنگ آزادی" کے اُن نتائج کو جو آج ظہور میں آرہے ہیں اگر (Washington) اور (Franklin) قبل سے جانتے ہوتے تو کیا وہ اس کی حمایت کرتے؟ ہرگز نہیں۔

جو کام کرامول، قیصر اور نپولین اپنے زبردست شاہی اقتدار اور رعب داب کے باوجود نہ کر سکے وہ چند جوشیلے اور تلون مزاج جرائم پیشہ ہرگز نہیں کرسکتے۔

ایک گمراہ، اور بدباطن یہودی بھی —— جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے ابتک لوگوں کو بغاوت پر خفیہ طور سے اُبھارتا رہا ہو —— یہ تسلیم کرنے میں شاید پس و پیش نہ کرے گا کہ کُتا اپنی قے کی ہوئی غذا کو دوبارہ کھانے پر فطرتاً مجبور ہے، اور اسی طرح سور بھی فطرتاً مجبور ہے کہ دھلنے کے بعد وہ کیچڑ میں لوٹے..... بعینہ اسی طرح ہم لوگوں کو یہ ماننا پڑے گا کہ جب تک انسان کی فطرت نہ بدل دیجائے، وہ، باوجود "اصلاحات" اور "انقلابات" کے "اصنام" ہی کا پرستار اور حرص و ہوا ہی کا بندہ بنا رہیگا

انسان کی ابتدائی ترقی جس نے موجودہ زمانہ میں ایک ایسی تہذیب اور طرز معاشرت قائم کر رکھی ہے جن کا دار و مدار محض تجارتی مفاد کے اصول پر ہے! لفظ "ترقی" کے صحیح مفہوم کی صرف بسم اللہ ہے ..... لیکن انسان کی "حقیقی ترقی" کا دور ابھی آکر رہیگا..... اور سچ تو یہ ہے کہ یہ ابھی سے ہم لوگوں کو

"پیغامِ فنا" کی بھی دھمکی دے رہا ہے:— موجودہ "ترقی موہوم" کے تعمیری عناصر، مثلاً "جنگ" اور "مقابلہ" "حقیقی ترقی" کے دور میں، بجائے سود مند ثابت ہونے کے، انسان کے لئے اسی قدر تخریبی اور مہلک ثابت ہوں گے جس طرح وہ اوصاف جو شیر کو۔ جب تک وہ جنگل میں رہتا ہے — "جنگل کا بادشاہ" کہے جانے کے قابل بناتے ہیں، اور جب وہ آبادی کی طرف رُخ کرتا ہے، تو انھیں اوصاف کی وجہ سے وہ بندوق کا نشانہ بنا دیا جاتا ہے!

اس طویل بحث کے بعد اب ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ انسان کی اجتماعی زندگی (Social life) کا انحصار "بلند مقاصد" اور "عقلِ سلیم" پر ہے۔ "جنگ" اور مقابلہ گرچہ ترقی کے "دورِ اولین" میں بہترین افراد کو منتخب کرنے کے لئے نہایت کار آمد ذرائع ثابت ہوئے.... تاہم "مزید ترقی" کے دور میں یہ بہت ہی تباہ کن اسبابِ تنزل بن جائیں گے، دور کیوں جاؤ اُن اقسام کے حیوانات اور نباتات ہی کو دیکھو جو صدیوں کے انتخابات کے نتائج ہیں، دفعتاً جب سلسلۂ انتخاب متروک ہو جاتا ہے، تو وہ "وحشی" اور "خود رو" ہو جاتے ہیں۔ بعینہ اسی طرح جب "جنگ" "مقابلہ" اور "حرص و ہوا" کی گرم بازاریاں زور پر ہوں گی، تو ان کا اصلی مطلب (یعنی قوم و ملت کے بہترین افراد کو منتخب کرنا) فوت ہو جائے گا، اور وہ موجودہ نظام مملکت اور طرز تمدن کے ضامن ہونے کے بجائے، تخریبی پہلو اختیار کر لیں گے، اور ترقی کی راہوں میں روڑے اٹکائیں گے اور موجودہ تہذیب — جو تجارتی مفاد کے اُصول پر قایم ہے:۔ (Commercial Civilization) اور موجودہ طرز تمدن اس سرعت سے "مائل بہ تنزل" ہونگے کہ دیکھنے والا یہ دیکھ کر کہ صدیوں کی ترقیاں چشم زدن میں پیوندِ خاک ہو گئیں، انگشت بدنداں رہجائیگا!

ایسے ایسے اتفاقات من گڑھت قصے نہیں ہیں،...... بلکہ اوراق تاریخ بھی شاہد ہیں کہ قبل اسکے کہ عوام الناس، ترقی کے اُن مدارج پر پہونچ سکیں، جو اعلیٰ ترین اور ارفع ترین انسان کے لئے مخصوص ہیں، انحطاط نے اُنھیں آدبایا ہے۔

اس لئے ہم لوگوں کو یہ خیالِ خام اپنے سروں سے بالکل نکال ہی دینا چاہئے کہ انسان کی موجودہ نسل کامل "ترقی" کی صلاحیت رکھتی ہے۔

ہمیں وہم و گمان ہوتا ہے کہ ہم ترقی کر رہے ہیں۔ کیونکہ جب کبھی ہم کو کسی غلطی کا احساس ہوتا ہے تو اسکا انسداد کر دیتے ہیں۔ اور اسی لئے ہم ترقی...... کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں... حالانکہ ہم یہ بھول جاتے ہیں

کہ بہت سی بُرائیاں، جن کی ہم گرفت کر سکتے ہیں، وہ زمانۂ دراز کے خفیہ گر مسلسل انحطاط کے نتائج ہیں، جواب "امراض کہنہ" کی شکل میں ظاہر ہوئے ہیں!.... ظاہر ہے کہ ہم لوگوں کی ناکمل اصلاحیں "کہنہ امراض" کو اچھا نہیں کر سکتیں.... اور رونا تو اس کا ہے کہ زندگی کے جن جن شعبوں میں ہم مائل بہ تنزلی ہیں وہاں ہمارے عمدہ اور قابل صد تحسین عادات و اطوار، حرکات و سکنات، خود ہماری نظروں میں بُرے معلوم ہونے لگتے ہیں اور برخلاف اس کے بُری باتیں بھلی معلوم ہونے لگتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم "ترقی" کے دھوکے میں اچھی چیزوں کے عوض بُری چیزوں کو اختیار کرتے چلے جاتے ہیں۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہم لوگوں کی سیاسی تباہی ہمارے بڑے ہی پرجوش مصلحین قوم ہی کے ہاتھوں ہونے کو ہے۔

(ماخوذ از برنارڈشا)　　　محمد عثمان - ام - اے - بی - ال وکیل ہزاری باغ

شہوانیات یا ترغیبات جنسی

حضرت نیاز کے قلم سے

جس میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات اور ان کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اور آئندہ اخلاق انسانی کی بنیاد کن اصول پر قایم ہونا ہے۔ الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے اور ایکبار شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز واقعات درج ہیں کہ آپ نے کبھی سُنے نہ ہوں گے اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول ۸ر کے مجلد کتاب صرف ۲ میں اور غیر مجلد ۱۲ر میں ملے گی اور اگر آپ نگار کے خریدار نہیں ہیں تو مجلد ۳ میں اور غیر مجلد ۲ میں علاوہ محصول ۸ر کے ملیگی۔

اگر

ارشاد ہو تو کتاب ذریعہ وی۔ پی روانہ کی جائے حجم ۲۰۵ صفحات آرڈر میں مجلد و غیر مجلد کی صراحت ضروری ہے

مینجر نگار لکھنؤ

تراب شاہ

(۱)

جمیل اور میں ساتھ منصفی کے امتحان میں شریک ہوئے لیکن تقدیر کی ستم ظریفی سے جمیل ایل ایل۔ بی میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوجانے کے باوجود منصفی کے امتحان میں فیل ہوگیا اور میں قانون سے طبعًا متنفر ہونے کے باوجود کانپور کا منصف بنادیا گیا۔ اب یہ نہ پوچھئے کہ مجھ نوگرفتار بلا نے شروع کے دو تین سال کس طرح کاٹے۔ کالج کی آزاد فضا میں سرکاری ملازمت عبارت تھی تعیش و حکمرانی سے لیکن عالم تخیل سے دنیائے حقیقت میں آنے کے بعد معلوم ہوگیا کہ یہاں حاکم رہکر محکوم اور مسرور رہکر مغموم بننا پڑتا ہے۔ کوئی تجویز لکھی اور دل میں پنکھے لگ گئے کہ کہیں ملزم اپیل نہ کردے جو حکامانِ بالا کے بے پناہ اعتراضات سے دوچار ہونا پڑے۔ معائنہ کا دن آیا اور جان تن سے نکل گئی پیشکار کو ہدایتیں کی جارہی ہیں کہ دیکھئے صاحب مسلیں سیدھے ترتیب رہنے پائیں میز کی چادر پر روشنائی کا دھبہ نہ پڑے۔ خلاصہ یہ ہے کہ علیگڈھ یونیورسٹی کے ماحول سے متاثر ہونے کے باوجود کانپور کے قیام میں آزادانہ زندگی بسر نہ کرسکا۔ بڑی مشکل یہ تھی کہ جن حضرات سے ملنے کو دل چاہتا تھا ان سے ملنا آئینِ حکمرانی کے خلاف تھا اور جن سے ملنا ضروری تھا وہ ملنے کے قابل نہیں تھے۔ شروع شروع میں شوکت۔ انوار وغیرہ سے پینگ بڑھائے دو دو بجے رات تک برج بھی ہوا پک نک پارٹی بھی ہوئی جشن کئے لیکن ادہر تو عوام الناس میں یہ مشہور ہوگیا کہ منصف صاحب بالکل صاحبزادے ہیں ہوحق کے علاوہ کچھ نہیں آتا ادہر حکامانِ بالا نے تنبیہ کی غرض مجبور ہوکر یہ رنگ بدلنا پڑا متین و سنجیدہ بنے تو سابقہ ایسے حضرات سے ہوا جن کا مطمح نظر وجاہت دنیوی حاصل کرنا تھا۔ آج کیا ہے خاں صاحب طلعت زماں تشریف لارہے ہیں۔ وجہ تشریف آوری پوچھئے تو ایک نیازمندانہ

انداز سے سر جھکا کر ارشاد فرمائیں گے "جی کچھ نہیں یونہی سلام کرنے حاضر ہو گیا" حالانکہ اس "جی کچھ نہیں" کا مطلب یہ ہے کہ خانصاحب خان بہادری کے خطاب کی دھن میں ہیں اور اسی لئے ہر حاکم کی (خواہ وہ منصف ہی کیوں نہو) دربارداری کی جاتی ہے۔ ان سے فرصت ملی تو لالہ ہری چند داس آنریری منصف نے کرم فرمایا۔ جناب اس لئے تشریف لاتے ہیں کہ ان کی آنریری منصفی میں رخنہ اندازی نہونے پائے اور جناب کا تمام تر وقت یہ ثابت کرنے میں گزرتا ہے کہ خود بدولت ہندو مسلم تعصبات سے بہت بالاتر ہیں بلکہ کچھ فطری رجحان دینِ اسلام کی طرف ہے حالانکہ ان کے رقیب محمد زماں خاں براہین قاطعہ سے ان کا مسلم کش ہونا ثابت فرماتے ہیں۔ ایک صاحب ہیں فاروق احمد خاں دیکھنے میں سیدھے سادھے مگر ان کے کاٹے کا منتر نہیں خدا جانے کتنے حکام کو بدنام کر کے کانپور سے نکلوا چکے ہیں۔ ان کا کام ہے حکام کا آلۂ تفریح بن جانا۔ شعر اچھا خاصہ موزوں پڑھ سکتے ہیں مگر جب پڑھیں گے توڑ مروڑ کر تاکہ لوگوں کو بیساختہ ہنسی آجائے انگریزی انٹرنس تک پڑھے ہیں لیکن اورجنل ناول کو اورنجیل ناول پڑھ کر ایک معصومانہ انداز سے اورنجیل کے معنے بھی پوچھیں گے تاکہ ان کے بھولے ہونے میں کسی کو شک نہ رہے۔ کبھی کسی مقدمے میں سفارش نہیں کریں گے مگر کچہری میں آپ کے بچہ کی دوا لیکر یا کوئی مضحکہ انگیز عذر پیش فرما کر اپنی صورت ضرور دکھا جائیں گے اور اپنے ادنے تبسم سے بے تکلفی کا ثبوت دیکر فریقین سے یا کم از کم مدعا علیہ سے کچھ نہ کچھ وصول فرمالیں گے۔ خود انصاف کیجئے کہ اس قسم کے لوگوں سے میری کیا دلچسپی ہو سکتی تھی اور اپنی جگہ پر اندازہ فرمایئے کہ اس بے کیف زندگی میں ایک مقدمے کے سلسلہ میں جمیل صاحب کا کانپور آنا میرے لئے کس حد تک طرب انگیز ثابت ہوا ہوگا؟

(۲)

جمیل آئے تو پورا ایک دن بقول نظیری "سخن گزشتہ" اور "گلہ ہائے دراز" کی نذر ہو گیا۔ اب تک کانپور نہ آنے کی شکایت ہوئی سال میں دو تین دفعہ آنے کے وعدے ہوئے۔ وکالت اور منصفی کے عیوب شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ بیان کئے گئے اور آخر کار باتوں کا ذخیرہ ختم ہو جانے کے بعد انداز استغنا کے ساتھ آرام کرسیوں پر دراز ہو گئے۔ دونوں کو احساس تھا کہ آج باتیں بہت کافی کی جا چکی ہیں مگر کبھی کبھی میں بحیثیت میزبان اور جمیل بحیثیت مہمان یہ خیال کر کے کہ یہ خاموشی فریقین پر بار ہو طرح طرح کے لایعنی سوالات کر کے اس طلسم سکوت کو توڑتے رہتے تھے۔ جمیل کے ساتھ تنہا رہنے کی خواہش کے

بادبود دل چاہتا تھا کہ کوئی تیسرا شخص آجائے اور "جمیل تمہارے یہاں کھانا کون پکاتا ہے،، "عباس تم نے یہ میز کتنے میں خریدی" کے بجائے کوئی دلچسپ گفتگو شروع ہوسکے اور ایسی حالت میں فاروق صاحب کا آنا بسا غنیمت معلوم ہوا - فاروق صاحب نے معمولی تعارف کے بعد جمیل صاحب کے کانپور تشریف لانے پر یہ مصرع پڑھ کر اظہار ابتہاج فرمایا اور حسب معمول اس مصرع کو مصرع نہ رہنے دیا - ع وہ آئیں گھر میں ہمارے یہ خدا کی قدرت ہے اس مصرع نے یاد ش بخیر حامد حسین کی یاد تازہ کردی اور میں نے ذرا مسکرا کر جمیل سے کہا " ہمارے خانصاحب بھی دوسرے حامد ہیں - موزوں شعر پڑھنا تو گویا قسم ہے" فاروق صاحب اپنے ہم مشرب کا ذکر سنکر فرمانے لگے "عباس صاحب یہ حامد کون بزرگوار ہیں ؟ " میرے جواب دینے سے قبل جمیل صاحب نے اپنی بپتا شروع کردی "حضت کیا عرض کروں کہ حامد کتنی خوبیوں کا شخص تھا بس یہ سمجھئے کہ لاجواب تھا - نثار بے مثل و بے نظیر تھا آئینہ مسلم یونیورسٹی میں بھانت بھانت کے جانوروں پر پھبتیاں وہی چست کرتا تھا ہاں شعر و شاعری سے طبیعت کو لگاؤ نہ تھا لے دیکے ڈاکٹر اقبال کی کبھی اے حقیقت منتظر والی غزل یاد تھی لیکن اسے بھی جب پڑھا غیر موزوں مگر صاحب کیا آدمی تھا واللہ صحیح معنوں میں دوست کہے جانے کا مستحق - فرسٹ ایر سے ہم لوگوں کا ساتھ ہوا اور آخر تک اس طرح نباہی کہ باید و شاید - کیوں عباس تراب شاہ والے معاملے میں اس کا ساتھ دینا یاد ہے ؟ " تراب شاہ کا نام آنا تھا کہ میں اپنی ساری متانت و سنجیدگی بھول کر بے اختیار ہنسنے لگا - میں نے ہنسی کو روکنے کی ناکام سعی کرکے کہا " تراب شاہ نام قوم مسلم " جمیل صاحب نے اضافہ فرمایا " ولدیت نامعلوم عمر تخمیناً ۴۰ سال " اور اس تشریح کے بعد ہم لوگوں نے مصنوعی متانت و سنجیدگی سے باری باری حسب ذیل حلیہ بیان کرنا شروع کیا " دوہرا بدن گندمی رنگ " " خونیں آنکھیں ڈاڑھی چڑھی ہوئی " " ماتھے پر تلوار کا نشان داہنے رخسار پر ایک بڑا سا مستہ " " زیادہ تر گیروے لباس میں رہتا ہے مگر کبھی کبھی انگریزی کپڑے بھی پہن لیتا ہے " فاروق نے ذرا تنگ ہوکر دریافت کیا " جمیل صاحب کیا تراب شاہ کوئی خدا رسیدہ فقیر تھے " جی نقیر و فقیر تو کچھ بھی نہیں تھے ہاں ایک نامی گرامی ڈاکو ضرور تھے - آپ نے کبھی فرخ آباد کے مشہور ڈاکو داراب شاہ کا نام سنا ہے ؟ بس یہ تراب شاہ انھیں کا بھتیجہ مشہور تھا لیکن صاحب اس کے کارنامے داراب کے کارناموں سے کہیں زیادہ وقیع ہیں " " اجی کہیں زیادہ ! " میں نے پروثوق لہجہ میں کہا " یہ سمجھئے کہ علیگڈھ یونیورسٹی کا بچہ بچہ اس سے کانپتا تھا - مضبوط سے مضبوط قفل کمروں میں ڈالے جاتے تھے مگر پھر بھی آئے دن یہ فریادیں سننے میں آتی تھیں کہ تراب شاہ کمرے کا قفل توڑ کر روپیہ پیسہ سوٹ بوٹ کھانے پینے کا سامان

نکال لے گیا اور لطف یہ ہے کہ "تراب شاہ کا وجود ہی نہ تھا" جمیل نے بات کاٹ کر کہا۔ "مگر" فاروق صاحب بولے "جب اس کا وجود ہی نہیں تھا تو اس نے یہ چوریاں کیونکر کیں اور اس کا حلیہ آپ حضرات کو کیوں حفظ ہے؟" مگر صاحب اس کا وجود تھا ضرور اگرچہ وہ وجود تخئیلی ہی کیوں نہ ہو اور حق تو یہ ہے کہ وجود تخئیلی ازدیاد شہرت کا سبب ہوتا ہے۔ سری کرشن کو دیکھئے نا۔ اگر ان کو محض 'پیغامبر اعظم' تسلیم کر لیا جاتا تو وہ عوام الناس کے دلوں کو اتنا مسخر نہیں کر سکتے تھے جتنا ان کی خیالی تصویر نے کرشن بھگوان بن کر کیا۔ حضرت غوث الاعظم کی شخصیت بحیثیت مصنف غنیۃ الطالبین یا بحیثیت ایک صوفی صافی کے اتنی جاذب نہیں ہے جتنی قطب ربانی محبوب سبحانی محی اموات خواجۂ کائنات کے اضافہ سے ہو جاتی ہے۔ پھر کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ خیالی کرشن بھگوان' یا فرضی 'محبوب سبحانی' نے کارہائے نمایاں انجام نہیں دئے؟ کیا آپ اس سے انکار کر سکتے ہیں کہ ان "جلیل القدر ہستیوں نے لاکھوں عقیدتمندوں کی بیماری کو مبدل بہ صحت ناامیدی کو مبدل بہ اُمید کر دیا؟ جب یہ باتیں قابل تسلیم ہیں تو پھر تراب شاہ کی تخئیلی ہستی سے انکار کیوں کیجئے اور اس کے کارناموں پر ایمان لانے سے کیوں ابا کیجئے؟ فاروق صاحب نے انداز معصومانہ سے سوال کیا۔ عباس صاحب آپ کی فلسفیانہ تقریر تو ہمارے سمجھ میں آئی نہیں اب یہ فرمائیے کہ کیا واقعی تراب شاہ ایک فرضی نام تھا اور آخر یہ نام رکھا کس نے؟" "مجھ سے سنئے" جمیل نے مسکرا کر کہا "عباس اور میں ایک دن بغیر اجازت لئے ہوئے قریب شام مچھلی کا شکار کھیلنے گئے۔ ہوا تیز تھی کوئی مچھلی لگی نہیں، ہم نے سوچا لاؤ نہا ہی ڈالیں۔ بنسیاں اور کپڑے کنارے پر رکھدئے اور جھم سے نہر میں کود پڑے۔ پیراکی ہم دونوں اچھے تھے میر مچھلی کے شاگردان خاص میں شمار ہوتا تھا دور تک پیرتے ہوئے چلے گئے واپس آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کوئی صاحب کپڑے اور بنسیاں غائب کر لے گئے ہیں۔ پہلے تو یہ سمجھ کر کسی بے تکلف دوست نے کرم فرمایا ہے دو چار آوازیں مرتضٰے خاں وغیرہ کو دیں پھر لاکھوں قسمیں خدا اور رسول کی دیں اظہار ناراضگی کیا اس قسم کے تکلیف دہ مذاق کرنے والے پر تبرا بازی ہوئی شدید انتقام کی دھمکیاں دی گئیں مگر جب کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تو چار و ناچار کنارے پر آکر بیٹھ گئے۔ عباس اس زمانے میں شرلاک ہومز کے افسانے بہت شوق سے پڑھا کرتے تھے انھوں نے یہ ترکیب بتائی کہ رات کے دس بجے تک یہیں بیٹھے رہو اس کے بعد یونیورسٹی چلو کوئی پوچھے تو کہدینا کہ عینک کا فریم بدلوانے شہر گئے تھے وہاں سے قلعہ کی طرف ہوتے ہوئے واپس آرہے تھے راستے میں ایک لمبے تڑنگے بدمعاش نے کپڑے وپڑے سب اتروا لئے خیر صاحب کوئی گیارہ بجے کے قریب باب الرحمۃ پہونچے۔ سپاہی نے پہلے تو یہ ہیئت کذائی دیکھکر اندر

آنے سے روکا لیکن جب نام دریافت کیا اور ہماری فرضی داستان سنی تو ہمیں لئے ہوئے پروائس چانسلر صاحب کی کوٹھی میں چلا گیا۔ ہم نے یہاں بھی اپنی بپتا دہرادی۔ پہلے تو پروائس چانسلر صاحب کو کچھ یقین نہیں آیا فرمانے لگے آپ کو پولیس میں بیان دینا ہوگا لیکن اگر آپ سارا حال مجھسے بیان کردیں تو میں اس معاملہ کو ختم کردوں گا لیکن جب ہم دونوں نے بیان دینا بھی منظور کرلیا تو وہ کچھ نرم پڑ گئے دو بڑے تولئے منگوا کے دئے اور کہنے لگے اس وقت تو آپ اپنے کمرے میں جائیں صبح ۸ بجے تشریف لایئے کوتوال شہر آپ کے بیان لیگا۔ میں سوچا کہ بُرے پھنسے اور میں نے عباس سے کہا بھی کہ میاں صبح ۸ بجے سے پیشتر پروائس چانسلر صاحب سے سارا حال بیان کردو بہت کریں گے کچھ جرمانہ کردیں گے خیر اس پولیس کی پکڑ دھکڑ سے تو بہتر ہے مگر صاحب یہ تو —" جمیل کو اتنی دیر تک مصروف تکلم دیکھ کر مجھے غبطہ ہونے لگا تھا میں نے بات کاٹ کر کہا "جی ہاں میں جانتا ہوں کہ آپ مجھے شرلاک ہومز ثانی کا لقب عطا فرمائینگے مگر خدا کے لئے فاروقی صاحب آپ ہی بتائیں کہ اگر میں جمیل کے کہنے پر عمل کرلیتا تو کیا حشر ہوتا بغیر پاس کے شہر جانا پہلا جرم، اب بجے تک واپس نہ آنا دوسرا جرم پروائس چانسلر سے غلط بیانی کا ارتکاب تیسرا جرم کہئے یونیورسٹی سے نکالے جانے میں کیا کسر باقی رہجاتی؟ پولیس کو بیان دینے میں کوئی خطرہ ہی نہ تھا بڑے شہروں میں ایک آدھ بدمعاش رہتے ہی ہیں کوتوال شہر کو ہم پر غلط بیانی کا شبہ کیوں ہونے لگا تھا اور اس کے علاوہ —" "للہ بات نہ کاٹا کرو" جمیل نے ذرا جھنجھلا کر کہا "مجھے قصہ تو ختم کرلینے دیا ہوتا ہاں صاحب خلاصہ یہ ہے کہ میں نے عباس کی رائے پر چلنا بہتر سمجھا اور صبح ہی صبح اپنے روم فیلو حامد کو بھی اس راز میں شریک کرلیا۔ حامد کوتوال شہر کے دور کے رشتہ دار تھے اور ان سے کافی مدد ملنے کی توقع تھی۔ ٹھیک آٹھ بجے پروائس چانسلر صاحب کی کوٹھی میں داخل ہوئے کوتوال صاحب ہم لوگوں کو حامد کی وجہ سے جانتے تھے نہایت نرمی سے تمام داستان بیان کرنے کو کہا۔ ہم نے لہجہ میں سوز و گداز پیدا کرکے اپنی بپتا سنائی فرمانے لگے اس کا حلیہ آپ کو یاد ہے۔ یہاں پر میں رکا مگر عباس نے خدا جانے کس کتاب میں کس شخص کا حلیہ دیکھا تھا کہ تیزی کے ساتھ وہی حلیہ بیان کرنا شروع کردیا جو ہم لوگ کچھ دیر بیشتر آپ کو سنا چکے ہیں۔ جب داہنے رخسار پر بڑے سے مسہ کا ذکر کیا تو کوتوال صاحب کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک پیدا ہوگئی ارشاد ہوا کہ آپ بالکل درست فرماتے ہیں موضع نیول پور میں جو ڈکیتی ہوئی تھی اس کے سلسلہ میں چوکیدار نے بیان کیا تھا کہ ایک ڈاکو کے گال پر بڑا سا نشان تھا غالباً

بوکھلاہٹ میں وہ مسّہ کو نشان سمجھا بلکہ چوکیدار تو اس کا کچھ نام بھی بتاتا تھا۔ تراب شاہ تو نام نہیں بھتا عباس نے ذرا مسکرا کر کہا۔ کوتوال صاحب نے مشکوک نظروں سے عباس کو دیکھا فرمانے لگے نام آپ کو کیونکر معلوم ہوا۔ عباس نے بلا کسی جھجک کے کہنا شروع کیا جی کیا عرض کروں جب ہم لوگ چلنے لگے ہیں تو اس نے کہا تھا کہ اگر پولیس میں رپورٹ کرنا تو تھانیدار سے کہدینا کہ اگر تمھیں ناکوں چنے نہ چبوائے تو راجپوت کا لڑکا نہیں اور تراب شاہ نام نہیں۔ اب تو کوتوال صاحب کی برہمی کی کوئی انتہا نہیں رہی کہنے لگے صاحبزادے تمھارے تراب شاہ ایسے سینکڑوں آدمی کالے پانی بھجوا چکا ہوں وہ ہے کیا چیز۔ کوتوال صاحب تو برہم ہو رہے تھے اور ہمارے پروائس چانسلر صاحب خندۂ زیر لب فرما رہے تھے۔

میں ڈرا یہ کہ کہیں عباس کے آخری فقرے سے وہ کھٹک نہ گئے ہوں اور اس لئے چپ چاپ اجازت لیکر واپس چلا آنا بہتر سمجھا۔ دوسرے دن حامد سے معلوم ہوا کہ پروائس چانسلر صاحب اپنے ایک چپراسی کو ساتھ لیکر کوتوال صاحب کے پاس گئے ان کا خیال تھا کہ چپراسی نے ان کی بیگم صاحبہ کا نیکلس چرایا ہے مگر چپراسی لاکھوں قسمیں کھاتا تھا اور کہتا تھا کہ کل شب کو میں نے ایک آدمی کو جس کے گال پر بڑا سا مسّہ تھا آپ کی کوٹھی کے پاس دیکھا تھا کوتوال صاحب اس بیان پر بہت ہنسے کہنے لگے فرمائیے جناب اب یہ لڑکوں کا مذاق تھا یا اصلیت ؟ میری عمر پولیس کی ملازمت میں بسر ہوئی ہے میں ایک نظر میں پہچان لیتا ہوں کہ کون آدمی سچا ہے اور کون جھوٹا۔ اگر آپ کے خیال کے مطابق میں عباس اور جمیل کے بیان کو مذاق پر محمول کروں تو یہ نیکلس کا واقعہ ان کے بیان کی تائید کرتا ہے آپ ہی فرمائیں کہ آخر چپراسی کو تراب شاہ کا حلیہ کیسے معلوم ہوا ؟ اسے بھی جانے دیجئے نول پور کے چوکیدار کو کیا غرض تھی کہ وہ فرضی حلیہ بیان کرتا ؟ اس کے علاوہ میں نے اپنے طور پر حامد سے بھی دریافت کیا یہ قسمیں کھاتے ہیں کہ عباس اور جمیل کے بیان میں مذاق کا شائبہ بھی نہ تھا۔ آپ کی خوشی ہے تو میں چپراسی پر تشدد کرنے کے لئے طیار ہوں مگر یہ یاد رکھئے کہ نیکلس کا ملنا منحصر ہے تراب شاہ کی گرفتاری پر اور وہی ہوا کہ کوتوال صاحب کے تشدد کے باوجود چپراسی نے اعتراف جرم نہیں کیا۔ نیکلس کا قصہ مشہور ہونا تھا کہ تراب شاہ کالج کی چاردیواری کے علاوہ شہر میں بھی بہت کافی مشہور ہو گئے۔ کہیں نقب زنی ہوئی تراب شاہ کا ذکر خیر موجود کوئی قتل ہوا قاتل تراب شاہ فرض کئے گئے۔ یونیورسٹی کے کسی طالب علم کی کوئی چیز گم ہوئی تراب شاہ ملزم ٹھہرائے گئے۔ اسی زمانہ میں ایک مقامی اخبار نے تراب شاہ کے کچھ مجرمانہ

واقعات بھی سپرد قلم فرمائے تھے مثلاً تراب شاہ روپیہ کو دو انگلیوں سے توڑ سکتا ہے اس کا روسیوں سے ساز باز ہے نہایت معتبر ذریعہ سے اطلاع ملی ہے کہ اس کے پاس کئی سو بندوقیں بھی ہیں غرض سال ڈیڑھ سال تک ایک ہنگامۂ عظیم برپا رہا۔ متعدد کانسٹیبلوں نے بارہا اسے شہر کی گلیوں میں چلتے پھرتے دیکھا لیکن گرفتار آخر وقت تک نہ کر سکے اور جب دو تین ماہ تک کوئی نیا جرم نہیں ہوا تو ارباب حل و عقد نے بجائے خود یہ طے کر لیا کہ تراب شاہ کا انتقال ہو گیا۔ جتنے واقعات تھے وہ بے کم و کاست عرض کر دئے اب تراب شاہ کی حقیقی یا فرضی ہستی کا بہتر فیصلہ آپ خود فرما سکتے ہیں" فارق صاحب کچھ فرمانے والے تھے کہ میں بول اُٹھا "مگر جمیل تم نے ایک خاص واقعہ بیان نہیں کیا۔ فاروق صاحب ایک دن ہمارے کمرے کا بوائے امین کسی ضرورت سے شہر گیا واپس آیا تو سراسیمہ و بدحواس میں نے پوچھا خیر تو ہے بوکھلائے ہوئے کیوں ہو، کہنے لگا میاں ڈگی تال کے پاس ایک آدمی ملا تھا جسکے گال پر بڑا سا مستہ تھا مجھسے پوچھنے لگا تم عباس صاحب یا جمیل صاحب کو جانتے ہو میں نے کہا کیوں تھیں کیا کام ہے کہنے لگا کام کیا جب ملنا تو کہدینا کہ تراب شاہ نے سلام کہا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ شاید کسی چیز کو چرانے کے لئے بوائے نے یہ قصہ گڑھ لیا ہو مگر ہمارے کمرے سے ایک تنکا بھی چوری نہ گیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ بوائے کا یہ بیان کہاں تک صحیح ہے اور کیا واقعی کوئی شخص ایسا موجود تھا جس کا حلیہ ہمارے بیان کردہ حلیہ سے ملتا تھا؟ فاروق صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "عباس صاحب کیا خوب کہا ہے غالب مرحوم نے کہ "عالم تمام ایک حلقۂ دام خیال ہے" اور جمیل اس مصرع پر بے اختیار ہنسنے لگے۔

طالب صفوی

ضرورت ہے شوہر کی

ایک ۱۸ سال کی نوجوان، خوشرو، سلیقہ مند اور تعلیم یافتہ لڑکی کے لئے ـــــ معاش کی طرف سے اطمینان ہونا چاہئے، اور عمر ۳۰ سال سے زائد نہ ہو۔ یو۔پی کے باشندہ کو ترجیح دی جائے گی ـــ اڈیٹر صاحب نگار سے ہر طرح کا اطمینان کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ لڑکی اور اس کے خاندان سے بخوبی واقف ہیں ـــ خط و کتابت اس پتہ سے کی جائے:۔

ا۔ن۔ ذریعہ منیجر نگار۔ لکھنؤ

مکتوبات نیاز

گزشتہ ماہ کی اشاعت میں آیندہ سے اس سلسلہ کے بند کرنے کا اعلان کیا گیا تھا، لیکن ناظرین کے اصرار پر اسے دسمبر تک اور قایم رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ غالباً اس وقت تک مکتوبات کتابی صورت میں ناظرین تک پہونچ جائے گی۔ نیاز

وہ جام و مینا کی سرگوشیاں، وہ صحنِ چمن میں درختوں کی گل پوشیاں، وہ ہلکی ہلکی پھوار، وہ رندانِ بدست کا ہنگامۂ "بادہ بیار"! — آہ کیا پوچھتے ہو

رات کسدرجہ یاد آئے ہو تم

بجلی چمکتی تھی اور تمہارا تبسم نگاہوں میں پھر جاتا تھا، سرو شمشاد ہوا سے جھومتے تھے اور تمہاری رعنائیاں آنکھوں کے سامنے آجاتی تھیں، ساغر میں شراب چھلکتی ہوئی دیکھتا تھا اور تمہاری آنکھوں کا تصور ستانے لگتا تھا —— اور ——

گل دیدمے در وے ترا یاد کردمے

پھر بتاؤ، تمھیں بتاؤ کہ

فریب خوردۂ نیرنگِ وعدہ ہائے تو کیست؟

وہ — ؟ جن کے پاس بے بُلائے پہونچ جاتے ہو۔ یا میں —— ؟ جس کے حق میں ایفاءعہد کی تم نے قسم کھائی ہے۔

اے، لاحول ولاقوۃ، کہاں کا جام وسبو، کیسی بادہ خواری!

آشفتگی کجا و ہوائے چمن کجا

تم نہ آئے تو ساری رات اسی اہتمام کے تصور میں کٹ گئی، جی چاہا کہ تمھیں بھی ستاؤں، یعنی تم پر

ظاہر کردوں کہ

تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی

ہوئی اور خوب ٹھاٹھ سے ہوئی، لیکن اس تنگ ظرفی کا بُرا ہو کہ جھوٹ بولنے کی بھی سمائی نہیں — یہ بیکسی کی آخری حد ہے۔ اب بھی اگر تم کو رحم نہ آئے تو خدا تم پر رحم کرے۔

نیاز

الفت پناہا، مودت دستگاہا،

گرامی نامہ پہونچا، سینہ پر رکھا، آنکھوں سے لگایا، اور دیر تک سوچتا رہا کہ آپ کے الطاف بے پایاں کا اعتراف کیونکر ممکن ہے۔ اگر روح القدس اپنی زبان مجھے دے بھی دیں، تو خضر و الیاس اپنی عمریں کیوں دینے لگے اور اگر یہ دونوں باتیں ممکن ہوں تو بھی اس کا کیا علاج کہ یہ اندازۂ تاثر میرے نزدیک وہ بھی ناقص ہے اور یہ بھی مختصر! آپ فرمائیں گے کہ یہ سب تکلف و تصنع ہے، میں عرض کروں گا

زخود بجوئے کہ ماراچہ در دل افتادست

آپ کہیں گے کہ یہ شاعری ہے میں کہوں گا "آداب عرض ہے"

بہرحال آپ کو نہیں معلوم، میں جانتا ہوں کہ آپ کا یہ التفات کیا مجھے کافر بنائے بغیر چھوڑتا ہے؟

زندہ و سلامت رہئے اور اسی انداز سے

عمر محبت دراز، رشتۂ الفت رسا!

نیاز

لاحول ولا قوہ، مصائب سے گھبراتے ہو، آلام و افکار سے پریشان ہوتے ہو، اور یہ نہیں دیکھتے کہ تم اتنے "اچھے" کیوں ہو۔

تونالی از خلائے خار دنگری کہ سپہر

سر حسین علی بر سناں بگرداند

زمانہ کا دستور ہمیشہ سے یہی چلا آیا ہے، اچھوں کی زندگی سدا یونہی بُری بسر ہوتی ہے، پہلو میں دل رکھتے ہو تو دُکھ اٹھانا پڑے ہی گا، شکوہ و شکایت بیکار ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ تم جن کے لئے تباہ ہو، وہی تم سے بیزار ہیں، جن کی دوستی میں تم برباد ہوئے

وہی تمہارے دشمن ہیں، لیکن کیا یہ تجربہ تمہاری یا دنیا کی فطرت کو بدل دے گا ۔۔ وہ نہیں تو اور ہزار ہیں تمہاری نیکی سلامت چاہئے، دشمنوں کی کیا کمی ـــ سونا ہونے کا دعویٰ ہے تو بار بار تپایا جانا ضرور۔

روئے کشادہ باید و پیشانی فراخ

آنجہ کہ لطمہ ہائے ید اللہ می زنند

میں ذاکر صاحب سے ابھی تک نہیں مل سکا اور ملوں بھی تو کس اُمید پر، جانتا ہوں کہ زبان سے "نہیں" کبھی نکلے گا نہیں اور دل کبھی "ہاں" کرنے کا نہیں۔ نیاز

مسکیں خبر از لذتِ آزار نہ دارد

خارم کن و در رہگزرِ چارہ گرم ریز

غالب کا یہ شعر مجھے بہت زمانہ سے یاد ہے، مگر جو بحث آپ نے پیش کی ہے وہ کبھی میرے خیال میں بھی نہ آئی تھی۔

آپ پوچھتے ہیں کہ دوسرے مصرع میں لفظ "کن" بالفتح پڑھا جائے یا بالضم، یعنی اسے "کندن" کا امر سمجھا جائے یا کردن کا ـــ میرے نزدیک ہر وہ شخص جس کو فارسی زبان اور غالب کے ذوق شعری کا صحیح علم ہے، اس کے ذہن میں بھی کبھی یہ اختلافی صورت نہیں آسکتی، معلوم نہیں آپ کے احباب کو کیوں یہ خلش پیدا ہوگئی۔

شاعر کا مقصود یہ کہنا ہے کہ ـــ "چارہ گر جو مجھے صبر و ضبط یا ترک محبت کی ہدایت کرتا ہے تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ غریب لذتِ آزار سے آگاہ نہیں، اس لئے اے خدا تو اسے بھی اس آزار سے آشنا کردے تاکہ وہ اپنی پند و نصیحت سے باز آجائے"

اس مفہوم سے غالباً آپ کو بھی انکار نہ ہوگا، پھر خود فیصلہ کیجئے کہ اس صورت میں یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ "مجھے کانٹا بنا کر چارہ گر کی راہ میں ڈالدے" یا یہ کہ "میرا کانٹا نکال کر اسکی رہگزر میں ڈالدے"

ظاہر ہے کہ نہ رہگزر سے مراد واقعی رہگزر ہے اور نہ خار سے مراد واقعی خار، بلکہ ایما و اشارہ ہے چارہ گر کی زندگی اور آزار محبت کی طرف، اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ "مجھے کانٹا بنا کر اس کی راہ میں ڈالدے" تو ظاہر ہے کہ خیال خار و رہگزر کے لغوی معنی کی طرف منتقل ہوگا جو مقصود نہیں، لیکن بصورت دیگر

مفہوم میں وہی معنوی رنگ پیدا ہو جائے گا جو شاعر ظاہر کرنا چاہتا ہے۔

علاوہ اس کے "مجھے کانٹا بنا کر راہ میں ڈال دے" کہنا اسوقت زیادہ موزوں ہوتا، جب جذبۂ انتقام بھی اس میں شامل ہوتا لیکن پہلے مصرع میں لفظ "مسکین" اس خیال کے منافی ہے۔ اسی کے ساتھ "فارسیت" کا اقتضا بھی یہی ہے کہ اسے کندن کا صیغۂ امر قرار دیا جائے۔

نیاز

آپ بھی سن لیجئے اور اُن سے بھی کہہ دیجئے کہ اعترافِ محبت کوئی گناہ نہیں کہ اس کی تعزیر میں آزمایش و امتحان کے مبادیات طے کرنا ضروری ہوں۔ غالب کہتا ہے

خجلت نگر کہ در حسناتم نیافتند
جُز روزۂ درست ز صہبا کشودہ

مگر یہاں تو انشاء اللہ نامۂ اعمال بالکل کورا ہی ملے گا، وہاں کم از کم ایک روزہ تو تھا خواہ وہ شراب ہی سے کیوں نہ کھولا گیا ہو، مگر یہاں تو ساری عمر اس حسرت میں بسر ہوئی کہ شراب ہوتی تو روزہ رکھا جاتا ——

بہر حال اُن سے محبت کرتا ہوں اور بالکل بے وجہ، اس لئے نہ مجھے دلیل لانے کی ضرورت اور نہ انہیں امتحان لینے کی —— وہ مجھے بلاتے ہیں شکریہ، لیکن اگر میرا آنا "شرطِ وفا" قرار دیا جاتا ہے تو کہہ دیجئے

میں نہیں جانتا وفا کیا ہے

وہ خود تو مارے معشوقیت کے میری ایک بات نہ مانیں اور میں پس پس کے برابر گرد رہ بنتا چلا جاؤں خوب!۔ اُن سے کہدیجئے کہ اگر وصلِ لیلیٰ کی شرط یہی ٹھہری ہے

تو استعفا مرا با حسرت و یاس

آج سے نہ وہ میرے محبوب، نہ میں ان کا چاہنے والا ——

لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

نیاز

کرم فرمائے بندہ ——

کل جعفر صاحب کی تحریر سے معلوم ہوا کہ آپ میری طرف سے لبریز شکایت ہیں، خیر، یہاں تک تو

کوئی مضایقہ نہ تھا، لیکن سنا گیا ہے کہ آپ نے مجمع احباب میں بعض ایسے الفاظ سے بھی یاد کیا جو نقطوں سے یکسر بیگانہ تھے ــــ حیرت ہے کہ آپ نے کیوں اسقدر التفات فراواں سے کام لیا ــــ

آپ میرے بزرگ ہیں میرے بزرگوں کے ملنے والے ہیں، پیرزادے ہیں، حسنی الحسینی سید ہیں، میں کیا کہہ سکتا ہوں سوائے اس کے کہ اس وقت تک تو میں اپنے آپ کو ایسا مکار و فریبی نہیں سمجھتا تھا، لیکن اب چونکہ آپ ایسا فرماتے ہیں، اس لئے ویسا بنجانے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ــ

گفتہ بودی ہمہ زرقند و فریبند فسوس
سعدی آں نیست ولیکن چو تو فرمائی ہست

چونکہ جناب کی اس توجہ کا شکریہ لازم تھا اس لئے یہ چند سطریں سپرد قلم کی گئیں، ورنہ اس سے منشاء حاشا، و کلا یہ ظاہر کرنا نہیں کہ میں کچھ اصلاح کی طرف مائل ہو گیا ہوں یا یہ کہ آپ کی بدعاؤں نے مجھے آل کے طرف سے خایف بنا دیا ہے ــــ یہاں تو جو بیراہ روی اول دن اختیار کر لی تھی، بحمد اللہ وہی ابتک قایم ہے ــ

آپ کے مذہب و ایقان کی بلندی سے ناواقف نہیں لیکن اپنے متعلق کس زبان سے عرض کروں کہ

کردہ ام ایمان خود را دستمزدِ خویشتن
می تراشم پیکر از سنگ و عبادت می کنم
لکم دینکم ولی دین

خاطی و گناہگار
نیاز

تو یہ کہئے آپ مجھ سے خفا ہیں! اور صرف اس لئے کہ میں نے آپ کے اُسی ایک خط کا جواب کیوں نہ دیا جو جواب طلب نہ تھا ــــ

بندۂ خدا، یہ تو سوچو کہ تم ۲۷ کو لکھ رہے ہو کہ "میں ۲۸ کو جا رہا ہوں" پھر میں تمھیں "خدا حافظ" کہتا بھی تو کس پتہ سے؟ میں انتظار میں تھا کہ منزل مقصود تک پہونچ جانے کے بعد تم پھر مجھے اطلاع دو گے اور میں دعائیں یا گالیاں جو کچھ دینا ہیں اسی وقت تفصیل سے دے لوں گا ــ مگر یہ خبر نہ تھی کہ خدا کی بارگاہ

تک پہونچ کر انسان میں خود بھی "پندار خدائی" پیدا ہو جاتا ہے، جس کا بڑا کارنامہ صرف "بیچا" بن جانا ہے۔
بہرحال شکر ہے کہ آپ مع الخیر اس مذہبی سفر سے واپس آ گئے، آپ اگر خفا ہیں تو زیادہ سے زیادہ یہ کیجئے کہ تبرکات میں سے مجھے کچھ نہ دیجئے، لیکن کسی بندہ کو دائرۂ بندگی سے خارج کر دینا، کہاں کی شانِ خداوندی ہے! — مدعا یہ کہ مجھ سے بولئے خواہ وہ کتنی ہی برہمی کے ساتھ ہو اور مجھ کو خط لکھئے خواہ اسمیں گالیاں ہی گالیاں کیوں نہ ہو۔
آپ سے ملنے کے بعد ہی تو یہ معلوم ہوا ہے کہ اہرمن بھی ایسی بُری چیز نہیں، پھر یہ خفگی بیکار ہے۔

نیاز

مکرمی۔
آپ نے جس مضمون کی طرف مجھے متوجہ کیا ہے، وہ میری نگاہ سے گزر چکا ہے۔ لیکن آپ میرے مسلک سے پوری طرح آگاہ ہیں اور اس لئے مجھ سے یہ توقع رکھنا کہ اس کا جواب دوں بیکار ہے۔

مہ نور می فشاند و سگ بانگ می زند

اور فرمائے آپ کے مشاغل کا کیا رنگ ہے؟ وہی ساری دنیا کا غم لئے ہوئے پھرنا اور ایک لفظ شکایت کا منھ سے نہ نکالنا — !

اے خوشا عمرے، کہ صرفِ راہِ استغنا شود

لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ سے زیادہ اس رمز کا سمجھنے والا مجھے تو کوئی دوسرا نظر آیا نہیں۔
اگر قربانیاں کرتے کرتے کوئی ہستی کبھی خود دیوتا بن سکتی ہے۔ تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ سے بڑا دیوتا پیدا ہونا اس صدی میں ممکن ہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ آپ کا انکسار اسے بھی تسلیم نہ کرے گا۔

نیاز

فلسفۂ مذہب

مذہب اسلام اور اس کے مراسم و شعائر پر تفصیلی بحث و تنقید اگر آپ اسلام کی تقلید سمجھ کر کرنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کا مطالعہ کیجئے۔ بہت کم جلدیں رہ گئی ہیں۔ قیمت علاوہ محصول عمہ ر
مینجر نگار - لکھنؤ

باب المراسلۃ والمناظرۃ

(اصغر گونڈوی کی شاعری)

ادیب محترم دامت افادالکم ــ مجھے اس بات کا اعتقاد ہے کہ آپ اُن لوگوں میں سے نہیں ہیں جو اپنی رائے کے خلاف کوئی صدا بلند ہوتے ہوئے سن نہیں سکتے۔ آپ کا طرز عمل شاہد ہے کہ اگر کسی نے آپ کو گالیاں بھی دی ہیں تو آپ نے اس کو بھی شائع کرکے معقول جواب دیا ہے لہذا میں اس کی امید نہیں رکھتا کہ آپ اس مضمون کو محض اس لئے واپس کردیں گے کہ یہ آپ کے ریویو کا جواب ہے۔ آپ اسکی مخالفت میں جو چاہے وہ نوٹ لکھدیں لیکن براہ عنایت اپنے رسالہ میں جگہ دیکر اپنی اخلاقی جرأت کا ثبوت دیجئے۔ اور مجھے رہین منت بنائیے مضمون کسی قدر طولانی ضرور ہے لیکن اس سے بہت زیادہ طولانی مضامین آپ کے رسالہ میں نکل چکے ہیں

نیاز کیش

شمس الدین

مندرجہ بالا کتاب پر نگار ماہ جون ۱۹۳۶ء میں اڈیٹر کا ریویو میری نظر سے گزرا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کم فرصتی کی وجہ سے اڈیٹر صاحب نے پوری کتاب نہیں دیکھی۔ یہ رائے ان کی بیشک صحیح ہے کہ پہلی ہی نظر میں ذاتیات کا گمان کرکے اس کتاب کی نسبت خراب رائے قایم ہوجاتی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص شروع سے آخر تک کتاب دیکھ جائے گا تو مجبوراً اس کو اپنی رائے بدلنا پڑے گی اس سبب سے کہ کتاب

پھر میں اصغر صاحب کہیں بھی مخاطب نہیں ہیں اور نہ ان کو براہ راست چیلنج دئے گئے ہیں بلکہ چیلنج انکے مداحین کو دئے گئے ہیں جنھوں نے ایک ہنگامہ اُٹھا کر اصغر صاحب کے مقابلہ میں تمام شعرا کو ذلیل کر کے انصاف پسند لوگوں کے دلوں کو تکلیف پہونچائی ہے۔

میں اُسی کتاب کے صفحہ ۸۴ و ۸۵ سے ایک فقرہ سرکوب صاحب کا لکھتا ہوں " دنیا جو چاہے سمجھے لیکن حقیقت میں میں اصغر صاحب کے خلاف نہیں ہوں بلکہ اُن لوگوں کے خلاف ہوں جو اصغر صاحب کی شاعری سے بخوبی واقف ہیں پھر بھی ان کو خلاف واقعہ بڑھاتے ہیں " اور صرف اسی ایک فقرے پر موقوف نہیں ہے بلکہ تمام کتاب اس قسم کے مضامین سے بھری ہوئی ہے کہ اصغر صاحب کی مخالفت محض اُن کے مداحوں کی وجہ سے ہوتی ہے جو اصغر کے مقابلے میں مشاق اور قادر الکلام شعرا کی توہین و تذلیل کرتے ہیں۔ اصغر کے دوستوں کو تو اصغر کی توہین ناگوار ہوتی ہے لیکن کسی دوسرے کو باکمال شعرا کی توہین و تذلیل اصغر ایسے شخص کے مقابلہ میں جو ایک نشست میں دو ایک شعر بھی نہیں کہہ سکتے ناگوار نہیں ہوسکتی۔ کتاب کو شروع سے آخر تک دیکھ کر ایک شخص بھی یہ رائے قائم نہیں کر سکتا کہ سرکوب کو یا اس کتاب کے کسی مضمون نگار کو اصغر سے کچھ ذاتی مخاصمت ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ معرض بحث میں اصغر صاحب ہی ہیں اس سبب سے نتیجہ جو نکلتا ہے وہ اصغر ہی کے خلاف نکلتا ہے اسی دھوکے میں آکر اڈیٹر صاحب نے بغیر کتاب کو شروع سے آخر تک دیکھے ذاتی مخاصمت کا گمان کر لیا۔

ہم اڈیٹر صاحب کے نہایت ممنون ہوں گے اگر وہ اصغر صاحب یا اُن کے دوستوں سے دریافت کر کے کوئی واقعہ ایسا لکھدیں جس سے اس کا شبہ بھی ہو سکے کہ سرکوب صاحب کو اصغر صاحب سے کوئی ذاتی رنج یا خصومت ہے۔ مبصر کی کسی اشاعت میں ایک مضمون سرکوب صاحب کا شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے یہ لکھا ہے کہ میرا اور اصغر کا ساتھ تین برس تک انڈین پریس میں رہا ہے اس درمیان میں میرے اور ان کے تعلقات ایسے خوشگوار رہے ہیں کہ کسی قسم کی شکر رنجی تو درکنار کبھی کسی معاملہ میں رائے تک میں بھی اختلاف نہیں ہوا لیکن مجھکو یہ کہنے میں بھی باک نہیں ہے کہ اصغر صاحب نہایت کم مشق شاعر ہیں اور فن شعر سے بالکل ناواقف۔

اصغر صاحب بھی اس کو مانتے ہیں کہ مجھ سے اور سرکوب صاحب سے کوئی ذاتی خصومت نہیں ہے اڈیٹر صاحب خود ان سے دریافت کر سکتے ہیں۔

بھلا اس کوب ایسے بے نیاز شخص کو کسی سے ذاتی خصومت شاعری کے معاملہ میں کیا ہو سکتی ہے جس کو نہ شہرت کی پروا نہ تعریف کی، ان کا کلام قریب قریب ہر ادبی رسالہ میں شایع ہوا کرتا ہے لیکن اُن کے نام سے نہیں بلکہ دوسروں کے نام سے، یہ الزام اُن پر بہت صحیح ہے کہ وہ اپنے نام سے کچھ نہیں کہتے بلکہ دوسروں کو اشعار کہہ کر بلا معاوضہ دیدیا کرتے ہیں جس سے اصغر صاحب بھی بخوبی واقف ہیں اگر کسی کی فرمایش سے کچھ اپنے نام سے کبھی پڑھتے بھی ہیں تو اُس کو محفوظ نہیں کرتے اس وقت ایک مصرع بھی اُن کے پاس محفوظ نہیں ہے لوگ اُن پر اعتراض کیا کرتے ہیں کہ آپ ان جواہر پاروں کو کیوں ضایع کر دیتے ہیں تو اُس کا جواب یہی ملتا ہے کہ یہ میرے جذبات نہیں تھے بلکہ دوسروں کی فرمایش سے مجبور ہو کر میں نے کہا تھا اُسکے حکم کی تعمیل ہوگئی پھر اب ان کے رکھنے کی کیا ضرورت ہے غرض یہ کہ اُن کا مزاج ہی ایسا نہیں ہے کہ اُن سے شاعری میں کسی سے ذاتی خصومت ہو سکے۔ یہ جھگڑا ذاتی خصومت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اسوجہ سے ہے کہ وہ اصغر کی قابلیت سے اچھی طرح واقف ہیں، اور مداحان اصغر جو اصغر کو باکمال شعراء پر ترجیح دیتے ہیں وہ اُن کو ناگوار ہوتا ہے۔

اس سے اڈیٹر صاحب بھی واقف ہیں کہ اصغر کے مداحوں نے نیا ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ نگار ہی کے کسی اشاعت میں مرزا احسان احمد کا مضمون شایع ہوا ہے جس میں اصغر کے مقابلے میں شعرائے لکھنؤ کے ذلیل کرنے کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا گیا یہاں تک الفاظ ہیں کہ "اصغر لکھنؤ کے گزشتہ و موجودہ شاعروں سے بہتر ہیں" مرقع میں ذوقی صاحب نے جو زہر اگلا ہے اس سے بھی غالباً اڈیٹر صاحب ناواقف نہ ہوں گے اس میں بھی یہاں تک لکھا گیا ہے کہ جس حدِ کمال پر شعرائے سابقہ و حال کی شاعری ختم ہو جاتی ہے وہاں سے اصغر کی شاعری شروع ہوتی ہے کیا کسی کی تعریف کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ اس کے مقابلے میں استادان گزشتہ و موجودہ ذلیل کئے جائیں۔ اسی اصغر کی شاعری حصۂ اول میں اڈیٹر صاحب بیخود فیض آبادی کا مضمون ملاحظہ کر لیں کہ انھوں نے یہ لکھا ہے کہ اصغر امام المتغزلین پیغمبر ذوقِ سلیم ہیں انھوں نے بڑے بڑے عفاریت سخن کو میدانِ شاعری میں پچھاڑ دیا ہے اور مخالفین اصغر کو جو گالیاں دی ہیں وہ بھی دیکھ لیں۔ خبیث - کمینہ - کم ظرف - شیطان علیہ اللعن کا شاگرد سب کچھ بنا دیا ہے (مضمون نمبر ۲ دیکھئے) یہ مداحان اصغر کی تہذیب ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب اصغر کے موافقین اور مخالفین دونوں کے مضامین اس کتاب میں بطور سوال و جواب کے ہیں تو کوئی شخص کیسے یہ رائے قایم کریگا کہ اصغر کی ذاتی مخاصمت کی بنا پر

یہ کتاب مرتب کی گئی ہے اڈیٹر صاحب کے نزدیک سرکوب صاحب تو انسان نہیں ہیں لیکن مداحان اصغر انسان ہیں۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ اس میں اصغر صاحب کا کچھ قصور نہیں ہے تو مخالفین اصغر کا بھی کچھ قصور نہیں ہے کیونکہ وہ اصغر صاحب سے کتاب بھر میں کہیں مخاطب نہیں ہیں بلکہ اُن کے مداحان سے مخاطب ہیں۔ اثر اس کا اصغر صاحب پر پڑے یا کسی اور پر وہ تو مداحان اصغر کی خبر لیتے ہیں۔ مشکل تو یہ ہے کہ اگر ان سانیت سے مداحان اصغر سے کہا جاتا تھا کہ بابا کسی شخص کی ایسی تعریف نہ کرو جو دوسرے کو ناگوار ہو تو بگڑ جاتے تھے اور کہتے تھے کہ اصغر کی تعریف ابھی ہوئی کہاں قیامت تک اگر تعریف ہوگی تب بھی ایک شمہ انکی حمد و ثنا کا بیان نہ ہوسکے گا۔ ایسا گروہ جو زبان اور محاورے کی غلطیوں کو اضافۂ زبان سمجھے جو شعر کی خامیوں کو عمق خیال کرے جو غلط اور ناقص شعروں کی تاویل کرکے اپنی سمجھ پر فخر کرے اور دنیا کو ناقابل اور نافہم خیال کرے اس کی سرکوبی سوائے اس کے اور کسی طرح نہیں ہوسکتی تھی کہ اُن لوگوں کو چیلنج دیدیا جائے کہ اچھا اصغر کو میدان امتحان میں لایئے تاکہ آپ کی سمجھ کا امتحان ہوجائے کہ جب آپ کو معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ اصغر کا شعر ہے اُسوقت آپ اُس کو پیغام خداوندی سمجھتے ہیں یا جب نہیں معلوم ہوتا اُس وقت بھی آپ اصغر کے شعر کی تعریف کرتے ہیں چنانچہ اصغر کی ایک غزل کے جواب میں جس کی تعریف میں علی گڑھ میگزین میں بہت مبالغہ کیا گیا تھا اُسی قسم کے اشعار بہت کم وقت میں کہکر ان کے مداحوں کے سامنے پیش بھی کردئے گئے ہیں جو اُسی کتاب کے صفحہ ۳۵ و ۳۶ میں ہیں اصغر کی بیجا تعریف کرکے عرش پر چڑھانے ہی کا یہ نتیجہ ہوا کہ اصغر کے دماغ میں یہ بات سماگئی کہ ہیچو من دیگرے نیست، اور لطف یہ کہ اپنی قابلیت کے ثبوت میں اصغر صاحب صرف یہی بات پیش بھی کرتے ہیں کہ میری تعریف بڑے بڑے لوگ کرتے ہیں لیکن جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ تعریف تو بہت سے وجوہ کی بنا پر ہوجاتی ہے آپ میں کچھ ذاتی جوہر بھی ہے یا نہیں تو اسکا جواب صرف خاموشی میں ملتا ہے۔ اصغر کا غرور اور مداحان اصغر کا جوش توڑنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ ان کا راز شاعری فاش کردیا جائے اس کو ذاتی مخاصمت سے تعبیر کرنا ہٹ دھرمی ہے اگر کسی شخص کو اخلاقی سبق دیا جائے کہ ہر شخص کی اُسی قدر تعریف کرو جس کا وہ مستحق ہے اور دوسروں کی تذلیل کرکے دنیا کو رنج نہ پہونچاؤ تو آپ اس کو ذاتی مخاصمت سمجھیں گے۔

اب رہگئی یہ بات کہ مداحان اصغر نے جو خلاف واقعہ ان کو بڑھایا اس کے جوابات ہوچکے تھے اسکی کیا ضرورت تھی کہ وہ سوال و جواب ایک کتاب کی صورت میں ایک جاکردئے جائیں اس سے تو

یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اصغر کے ذلیل کرنے کے واسطے یہ کام کیا گیا اور اسی کو خصومت کہتے ہیں تو یہ اعتراض بھی وہی شخص کرے گا جس نے غور سے وہ پوری کتاب نہ پڑھی ہو گی جو شخص غور سے پڑھے گا اسکو مداحان اصغر کا کیرکٹر معلوم ہو جائے گا کہ واقعہ سے انکار کرنے میں ان کو کچھ باک نہیں ہوتا غلط بیانی اور دروغ گوئی میں شہیر ہوتے ہیں۔ طالب علم نے جو یہ لکھا کہ مداحان اصغر باوجود چیلنج دینے کے کبھی اصغر صاحب کو میدان امتحان میں نہیں لائے اس کی نسبت ایک مداح نے جس نے اپنا نام راستگو رکھا ہے یہ لکھدیا کہ یہ بالکل جھوٹ واقعہ ہے اور سراسر اصغر صاحب پر بہتان ہے (مضمون نمبر ۳ دیکھئے) یہ ظاہر ہے کہ کسی اخبار کے پرچے کوئی کہاں سے تلاش کرکے بروقت لاتا لہٰذا وہ مضامین اکٹھا کر دئے گئے تاکہ بروقت ضرورت پیش ہوا کریں۔ غرض یہ کہ اس کتاب کی ترتیب کا باعث بھی مداحان اصغر ہوئے اگر وہ غلط بیانی اپنا شیوہ نہ قرار دیتے تو کتاب بھی مرتب نہ ہوتی۔ سرکوب نے کتاب کے ترتیب کی غرض جو دیباچے میں لکھی ہے اس کو بھی دیکھ لیجئے اس سے بھی اصغر صاحب کے ساتھ کوئی ذاتی خصومت نہیں پیدا ہوتی بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ ہنگامۂ اصغر کو روکنے کی غرض سے کتاب مرتب ہوئی ہے میں اس کو یہاں لکھے بھی دیتا ہوں۔

"میں نے اس امید پر اس مجموعے کو مرتب کیا ہے کہ شاید مداحان اصغر کو یہ خیال آجائے کہ اب ہماری شرم و حیا کے چرچے ملک میں بہت زیادہ ہونے لگے لہٰذا اخباروں اور رسالوں کے صفحات کو الگ کرکے اپنی غیرت داری کا زیادہ ثبوت نہ دینا چاہئے۔"

غرض یہ ہے کہ سرکوب صاحب کو کوئی ذاتی مخالفت اصغر صاحب سے نہیں ہے لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ مداحانِ اصغر کی بیجا سختیوں اور ترجیح بلا مرجح سے ان کو ایک قسم کی ضد ضرور پیدا ہو گئی ہے کہ ہم اصغر کے کل راز رفتہ رفتہ کھولدیں گے ابھی پہلا حصہ ہے دوسرے اور تیسرے حصہ میں اس سے زائد راز اصغر صاحب کے کھلیں گے۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ سرکوب کے نام ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اصغر کی دل آزاری اور اُن کے ذلیل کرنے کے لئے یہ کتاب مرتب کی گئی ہے اس کا جواب تو یہی ہے کہ اصغر کے نام ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت چھوٹے آدمی ہیں پھر وہ کیوں اس قدر بڑھائے جاتے ہیں۔ بندہ پرور اس کتاب کے واسطے یہ نام نہیں ایجاد کیا گیا بلکہ یہ اُن کا بہت پُرانا تخلص ہے اس کتاب کی ترتیب سے بہت قبل۔

ان کی نظمیں سرکوب کے نام سے اودھ پنچ وغیرہ میں موجود ہیں ایک شخص کے دو تخلص کوئی نئی بات نہیں ہے بہت لوگوں کے ایسے تخلص تھے۔ نواب مصطفےٰ خاں کا تخلص شیفتہ بھی تھا اور حسرتی بھی اگر آپ کتاب دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو جائے کہ کہاں پر وہ سرکوب تخلص کرتے ہیں اور کہاں پر حامد۔

میری رائے میں اڈیٹر صاحب کا یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ اصغر صاحب سنجیدگی اور انسانیت کی وجہ سے چیلنج کو قبول کر کے میدان امتحان میں نہیں آتے اور اُن کے نہ آنے سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ وہ شعر نہیں کہہ سکتے۔ میں یہی عرض کروں گا کہ یہ اڈیٹر صاحب کی نیک نفسی ہے ورنہ واقعہ یہی ہے کہ اصغر صاحب اپنی کمزوری کی وجہ سے میدان امتحان میں نہیں آتے اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ آپ تو محض قیاس کی بنا پر کہتے ہیں اور جس شخص نے ان کی کمزوری اور شعر کہنے سے عاجز رہنے کا راز کھولا ہے اس نے تجربہ کیا ہے۔ تین برس تک اس کا اور اصغر صاحب کا ساتھ ایک ایسے ادبی کام میں رہا ہے جس میں شعر کہنے کی بھی ضرورت ہوتی تھی وہاں پر انسانیت کو کام میں لانے کا کوئی سوال نہیں تھا کیونکہ نوکری کا معاملہ تھا لہذا اُس کا تجربہ اڈیٹر صاحب کے قیاس سے کہیں زیادہ وقیع ہے یہ زبردستی ہے کہ آپ اپنے قیاس کو کسی کے تجربے پر ترجیح دیں اور اگر اڈیٹر صاحب اس کو نہ مانیں گے تو ہم مجبوراً وہی عرض کریں گے جو مخالفین اصغر نے اس کتاب میں لکھا ہے کہ جس شاعر کو اڈیٹر صاحب سنجیدہ انسان سمجھتے ہوں اس کو اسی قسم کے چیلنج دیکر دکھا دیں کہ وہ میدان امتحان میں نہیں آتا اور اپنی ناقابل برداشت بدنامیوں کے زہر کو شربت کے گھونٹ کی طرح پی جاتا ہے تو ہم مان لیں گے کہ اڈیٹر صاحب کی رائے صحیح ہے۔ میری رائے تو یہ ہے کہ اڈیٹر صاحب کی جرارت ہی نہ ہوگی کہ کسی مشاق شاعر کو وہ اس قسم کے چیلنج دیدیں اس سبب سے کہ ڈریں گے کہ وہ میدان امتحان میں آکر ان کو ذلیل کر دے گا۔ ایسی جرأت صرف اُسی شاعر کی نسبت ہو سکتی ہے جس کی کمزوری اور عاجزی کا یقین ہو اور یقین بغیر تجربے کے نہیں ہو سکتا چونکہ سرکوب صاحب کو تجربے سے یقین ہو گیا تھا اس وجہ سے مداحان اصغر کو چیلنج دئے گئے اور ان کے تجربے کو لوگوں نے صحیح مان لیا۔

کیا انسانیت کے خلاف یہ نہیں ہے کہ باکمال شاعروں کی اپنے مقابلہ میں توہین کرائی جائے لیکن اس سے اصغر صاحب کبھی نہیں چوکتے کبھی بحث کر کے ان سے دیکھئے کہ وہ اپنے مقابلہ میں کسی کو سمجھتے ہیں۔ جب تک گنجایش تھی اسوقت تک اصغر صاحب پر جو اعتراضات ہوتے تھے ان کے

جواب لکھنے میں انسانیت کو دخل نہیں دیا جاتا تھا اب جب سوائے اس کے اور کوئی گنجایش نہ رہی کہ اصغر میدان عمل میں لائے جائیں تو عصمت بی بی بے چارگی" ہو کر سب کے سب انسان بن گئے۔ اگر اڈیٹر صاحب کو کسی شخص کی بابتہ ذاتی تجربہ ہو جائے کہ وہ شعر کہنے سے عاجز ہے اور اس کے امتحان میں نہ آنیکا سبب لوگ اس کی انسانیت ظاہر کریں اس وقت تو اڈیٹر صاحب اس کی انسانیت کے قایل نہ ہونگے لیکن سرکوب صاحب پر یہ ظلم کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ذاتی تجربے کو کوئی چیز نہ سمجھیں اور اڈیٹر صاحب کے قیاس کو صحیح سمجھ کر اصغر کی انسانیت کے قائل ہو جائیں۔ اڈیٹر صاحب کے اُصول کے مطابق تو ہر جاہل شخص اپنے عالم ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے اور اڈیٹر صاحب کو اس کو عالم ماننا پڑے گا اس سبب سے کہ جہل اور علم کا فیصلہ صرف امتحان کر سکتا ہے اور امتحان اڈیٹر صاحب کے نزدیک خلاف انسانیت ہے لہذا جاہل کو عالم ماننا انھیں واجب ہو جائے گا۔ اڈیٹر صاحب کوئی انسان خواہ ملک سیرت ہی کیوں نہ ہو کسی بات پر قدرت رکھتے ہوئے اس بات کے متعلق اپنی بدنامی ہرگز گوارا نہیں کر سکتا۔ مضمون چونکہ طول ہو گیا ہے اس وجہ سے ہم اس مبحث کے شواہد پیش کرتے ہوئے اس وقت اس لئے ڈرتے ہیں کہ اڈیٹر صاحب طوالت کا الزام رکھکر مضمون کو واپس کر دیں گے لہذا اڈیٹر صاحب سے صرف اتنی استدعا کرتے ہیں کہ وہ کتاب کو شروع سے آخر تک دیکھ جائیں۔ چھوٹی سی کتاب ہے تین گھنٹے سے زاید وقت ان کا نہیں خراب ہوگا اگر کتاب دیکھنے کے بعد بھی ان کی رائے یہی قائم رہے کہ اصغر انسانیت کی وجہ سے میدان عمل میں نہیں آتے تو دوسرے حصہ کا انتظار کریں جس میں اس کا پتہ دیا گیا ہے کہ اصغر کی کونسی غزل کس کی کہی ہوئی ہے اور اس کا ناقابل تردید ثبوت بھی ہے۔

بعض لوگ جن کے دماغ فونوگراف ہیں اصغر صاحب کے کہنے سے یہ کہتے پھرتے ہیں کہ سرکوب صاحب تخریبی کام کر رہے ہیں اور اصغر صاحب کے مداح تعمیری کام کرتے ہیں اگر تعمیری کام کے یہی معنی ہیں کہ دنیا کو دھوکا دیا جائے اور ایک شخص جو سیر بھر کا ہے وہ من بھر کا کر کے دکھایا جائے اور تخریبی کام یہ ہے کہ اُس دھوکے سے لوگوں کو آگاہ کر دیا جائے تو میری رائے میں دنیا کو تخریبی ہی کام کرنا چاہئے۔ تخریبی کام تو یہ ہے کہ کسی اچھے کام میں خرابی ڈالی جائے اس کو کوئی انصاف پسند اچھا کام نہیں کہہ سکتا کہ واقعہ کے خلاف کوئی شخص بڑھایا جائے اور دوسرے باکمال حضرات اُس کے مقابلے میں گھٹائے جائیں۔ بعض آدمی جو یہ کہتے ہیں کہ اگر اصغر اپنے کو اپنے دوستوں کے ذریعہ سے بڑھاتے ہیں تو اپنے

کو آپ بھی بڑھائیے یہ کیا ضرورت ہے کہ آپ ان کو گھٹا کر آپس میں رنجش پیدا کیجئے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کون سی اخلاقی تعلیم ہے کہ اگر کوئی شخص دنیا کو دھوکا دیتا ہے تو آپ اس کے دھوکے کو کیوں طشت ازبام کرتے ہیں آپ بھی دنیا کو دھوکا دیجئے۔ مان لیجئے کہ آپ کو معلوم ہے کہ ایک شخص دوسروں سے غزل کہلا کر پڑھتا ہے تو کیا آپ اس کے اس راز کو فاش نہ کیجئے گا بلکہ خود بھی دوسروں سے غزل کہلا کر پڑھئے گا اصل میں اسوقت جو اصغر صاحب کی بابت بحث ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ ایک فریق تو ان کی شہرت پر جاتا ہے دوسرا فریق اپنا ذاتی تجربہ بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر میرے تجربے کو تم غلط سمجھتے ہو تو اس کا امتحان کرلو آپ کہتے ہیں کہ امتحان انسانیت کے خلاف ہے پھر آخر فیصلہ ہو تو کیسے ہو۔ عجب زبردستی ہے کہ اپنے تجربے پر خاک ڈالو اور جو ہم کہتے ہیں اس کو بلا دلیل مانو۔

ہم اس کو مانتے ہیں کہ اڈیٹر صاحب کو یہ کتاب دیکھ کر تکلیف ہوئی ہوگی لیکن ان کو سرکوب صاحب کی بھی تکلیف کا احساس ہونا چاہئے کہ جس شخص کی قابلیت سے وہ واقف ہوں اس کی نسبت ایسے الفاظ دیکھ کہ وہ گزشتہ اور موجودہ شاعروں سے بہتر ہے کس قدر تکلیف ہوئی ہوگی اور اس تکلیف سے متاثر ہو کر اگر انھوں نے اصغر کا راز کھول دیا تو کیا گناہ کیا۔

اس وقت تک اس کتاب پر آٹھ دس اخباروں اور رسالوں میں میں نے ریویو دیکھے سوائے اڈیٹر نگار کے اور کسی کا ریویو میں نے اس کتاب کے خلاف نہیں دیکھا ممکن ہے جیسے انھوں نے بغیر کتاب کے دیکھے قیاس پر ریویو کر دیا ایسا ہی اور بھی کسی نے کیا ہو لیکن میری نظر سے نہیں گزرا غرض یہ کہ جن لوگوں نے کتاب کے اندر رہ کر رائے قایم کی ہے وہ اس کتاب کے خلاف نہیں ہوئے۔ ہر انصاف پسند کی یہ رائے ہے کہ اس کتاب نے اصغر کا راز افشا کر کے ملک پر احسان کیا ہے اور بیجا نمایش کرنے والوں کا سد باب کر دیا ہے۔ ان مضامین کے یکجا ہو جانے سے اصغر کی اصلی قابلیت ظاہر کر دینا ہر شخص کے لئے آسان ہو گیا ہے اور لوگوں کو اس کا سبق حاصل ہو گیا ہے کہ کسی شخص کی تعریف کرنے میں اس کو حد سے زیادہ نہ بڑھانا چاہئے۔

سرکوب صاحب خود انسان ہوں یا نہوں لیکن یہ تو اڈیٹر صاحب کو ماننا پڑے گا کہ انھوں نے مداحانِ اصغر کو انسان بنا دیا اس سبب سے کہ جب سے کتاب نکلی ہے اصغر صاحب کی مداحی بند ہو گئی ہے اور اس کی اُمید نہیں ہے کہ کتاب کو دیکھکر کوئی غیرت دار اصغر کی ایسی مداحی کرے جس میں

استادان گزشتہ یا موجودہ کی توہین و تذلیل ہو اور یہی مقصد اُس کے مرتب کرنے کا تھا کہ مداحان اصغر انسان بن جائیں معلوم نہیں اڈیٹر صاحب کس کو اچھا سمجھتے ہیں انسان کو یا انسان گر کو۔

جیسا متعلم ہوتا ہے معلم ویسی ہی تعلیم دیتا ہے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ مداحانِ اصغر پر انسانیت کا اثر نہیں ہوتا تو غیر انسان بن کر انھوں نے سب کو انسان بنا دیا۔ ہر کام کے نتیجہ پر غور کرنا چاہئے سرکوب صاحب کو جیسی اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی ہے شاید ہی کسی کو ہو کہ ہنگامہ اصغر کو انھوں نے فرد کر دیا اور مداحان اصغر کی زبان بند ہو گئی۔

(نگار) اس طویل مراسلہ کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

(۱) سرکوب الہ آبادی نے اپنی کتاب جو " اصغر گونڈوی کی شاعری " کے عنوان سے شایع ہوئی ہے اصغر پر کوئی حملہ نہیں کیا بلکہ خطاب ان لوگوں سے ہے جو ان کی حمایت میں دوسرے شعراء کو بُرا کہتے ہیں۔

(۲) اصغر صاحب واقعی شاعر نہیں ہیں یا یہ کہ اگر ہیں تو بہت کم مشق۔

(۳) سرکوب صاحب بہت بے نیاز شخص ہیں اور باوجود بہترین شاعر ہونے کے وہ اپنے آپ کو شاعر کہلانا پسند نہیں کرتے، اس لئے انھیں اصغر صاحب سے کیا عناد ہو سکتا ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ پہلے میں نے اس کتاب کو بالاستیعاب نہیں پڑھا تھا لیکن دوبارہ جب مراسلہ نگار صاحب کے اصرار پر میں نے اسے پڑھ لیا، تو بھی کسی دوسرے نتیجہ پر نہیں پہونچا۔

اگر معاملہ صرف اصغر کے مداحوں کا تھا (جیسا کہ مراسلہ نگار صاحب لکھتے ہیں) تو پھر اصغر صاحب اور ان کی شاعری کو درمیان لانے کی کیا ضرورت تھی، لیکن چونکہ اصل مقصود تو یہی ظاہر کرنا تھا کہ اصغر کو شعر کہنا نہیں آتا، اس لئے تمام مباحث سے نتیجہ یہی ایک نکالا گیا ہے۔ پھر مجھے اس سے اتفاق نہیں کہ اصغر صاحب اگر شعر اچھا نہیں کہتے تو خواہ مخواہ ان کی شاعری کو سراہا جائے، میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ مداحانِ اصغر، اپنے ممدوح کو اچھالنے کے لئے دوسروں کی توہین و تذلیل کریں اور یقیناً میرے نزدیک یہ امر بھی پسندیدہ نہیں کہ اصغر صاحب (اگر وہ واقعی شاعر نہیں ہیں) اپنے آپ کو شاعر کی حیثیت سے پیش کرنے پر اصرار کریں۔ لیکن یہ تمام باتیں اس کو کیونکر مستلزم ہو سکتی ہیں کہ اصغر کی شاعری کے سلسلہ میں اصغر کی ذات کو سامنے لایا جائے۔

اس سلسلہ میں سرکوب یا کوئی اور نقاد یہ کہہ سکتا ہے کہ جب بحث یہ آن پڑے گی کہ اصغر شعر کہنا جانتے ہیں یا نہیں تو لامحالہ ان کی ذات اس میں شامل ہو جائے گی ــــ یہ توجیہہ بالکل درست ہے لیکن مجھے گفتگو اسی میں ہے کہ اول تو اس بحث کے اُٹھانے کی ضرورت ہی نہیں اور اگر ہو تو اسکے لئے کوئی قوی دلیل موجود ہونا چاہئے ــــ چیلنج قبول نہ کرنا، یا مشاعرہ میں سب کے سامنے غزل نہ کہہ سکنا یا طرح پر غزل کہنے میں پس و پیش کرنا، یہ ایسے دلایل نہیں ہیں کہ اصغر کے غیر شاعر ہونے کے ثبوت میں کوئی وزن رکھ سکیں۔

ایک شاعر کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ہر وقت ہر شخص کی فرمایش یا ہر طرح پر شعر کہنے کے لئے طیار ہو جائے، بلکہ میرے نزدیک ایک حقیقی شاعر کبھی اس کی پابندی کر ہی نہیں سکتا، اور جو لوگ اس " ورلے برندش" قسم کی شاعری پر قدرت رکھتے ہیں وہ اکتسابی شاعر ہیں اور زیادہ سے زیادہ انھیں "متشاعر" کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے اصغر کے خلاف اس نوع کے دلایل پیش کرنا، میرے نزدیک اُنکی شاعرانہ اہلیت کو اور زیادہ مستحکم کرنا ہے نہ یہ کہ انھیں اُن کے شاعر نہ ہونے کے ثبوت میں پیش کیا جائے۔

یہ ہو سکتا ہے کہ اصغر پُرگو شاعر نہ ہوں اور ان کا دماغ بہت کم شاعری کی طرف متوجہ ہوتا ہو، لیکن سوال یہ ہے کہ جس وقت ان پر شاعرانہ کیفیت طاری ہوتی ہے (خواہ وہ سال میں ایک ہی بار کیوں نہ ہو) تو شعر کیسا کہتے ہیں ــــ اور اس صورت میں زیادہ سے زیادہ ہم یہی کر سکتے ہیں کہ صرف ان کے کلام پر رائے زنی کریں نہ یہ کہ سرے سے ان کے شاعر ہونے ہی کا انکار کر دیں۔ اگر سرکوب صاحب کے پاس کوئی ثبوت اس امر کا ہوتا کہ اصغر نے اس وقت تک جو کچھ کہا ہے وہ فلاں شخص کی فکر کا نتیجہ ہے تو بیشک دوسری بات تھی، لیکن محض چیلنج یا طرح وغیرہ کے جھگڑوں کو سامنے لا کر ایسا حکم لگانا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

اصغر صاحب کا کلام اس وقت تک جتنا شائع ہو چکا ہے اس کے دیکھنے کے بعد ایک شخص یہ حقیقت تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ وہ شاعر پیدا ہوئے ہیں اور جب وہ کوئی شعر کہتے ہیں تو کسی خاص جذبہ سے متاثر ہو کر کہتے ہیں۔ لیکن چونکہ کسی شخص کا شاعر پیدا ہونا یا جذبات سے متاثر ہو کر کوئی شعر کہنا اسکو ضروری نہیں قرار دیتا کہ جب وہ کوئی شعر کہے تو اچھا بھی ہو اور اس میں کوئی غلطی نہ پائی جائے، اسلئے بحث کا دائرہ محدود ہو کر صرف اتنا رہجاتا ہے کہ اصغر کا کلام کیسا ہے اور اس پر اگر دیانتدارانہ تنقید کی جائے تو کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔

میں اصغر کی شاعری کے متعلق ایک سے زاید بار اپنی رائے کا اظہار کرچکا ہوں اس لئے اس کے تکرار کی ضرورت نہیں، لیکن مجملاً و مختصراً سلسلۂ سخن میں اس موقعہ پر بھی اتنا ظاہر کردینا بے محل نہ ہوگا کہ اصغر صاحب جذباتی شاعر ہیں، فطرت کی طرف سے شاعرانہ دماغ لیکر آئے ہیں، اور جب اپنے تاثرات ظاہر کرنے کے لئے ان کو موزوں الفاظ مل جاتے ہیں تو بے مثل شعر کہہ جاتے ہیں۔ لیکن جب وہ اسمیں کامیاب نہیں ہوتے تو شعر بھی ناقص رہجاتا ہے۔

مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اصغر صاحب کے خلاف یہ ہنگامہ زیادہ تر مذہبی اختلاف کی بنا پر ہے یعنی سرکوب صاحب چونکہ شیعہ پارٹی کے سردار ہیں اس لئے وہ اصغر صاحب کی مخالفت کرتے ہیں جنھوں نے الہ آباد پہونچکر ایک جماعت شیعوں کی سنیوں کے خلاف فراہم کرلی ہے ۔۔۔ میں اس باب میں سوائے اظہار افسوس کے اور کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ میرے نزدیک ایک انسان کا بدترین جذبہ یہی ہے کہ وہ اختلافِ مذہب کی بنا پر دوسرے انسان کا دشمن ہوجائے اور اگر اس میں کچھ بھی شائبۂ صحت ہے تو میں سرکوب صاحب سے تو نہیں، کیونکہ مجھے ان کی خدمت میں نیاز حاصل نہیں ہے لیکن اصغر صاحب کی بارگاہ میں ضرور عرض کروں گا کہ وہ اپنی انسانیت کو اس نوع کے ذلیل و رکیک جذبہ سے مجروح نہ کریں کیونکہ ایک حقیقی شاعر کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ حقیقی معنی میں انسان بھی ہو اور انسانیت کا اقتضا یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ وہ اختلاف مذہب کی بنا پر کسی کی مخالفت کرے۔

اگر شیعہ جماعت کی طرف سے واقعی کوئی زیادتی ہو، تو بھی اصغر صاحب کو انتقام کی پست سطح پر اُتر آنے کی ضرورت نہیں ۔ وہ تو صوفی منش انسان ہیں اس لئے ان سے زیادہ اس رمز کو کون سمجھ سکتا ہے کہ :-

خوش بود فارغ ز بند کفر و ایماں زیستن
حیف کافر مردن و آوخ مسلماں زیستن

دو ادبی شاہکار

شوپنہار ۔۔ فلسفۂ شوپنہار پر ایک بےمثل تبصرہ ۸؍ (علاوہ محصول)
مثنوی زہر عشق ۔۔ مجلد مع رنگین تصاویر تین مقدمات قیمت ۸؍ (علاوہ محصول)

مینیجر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

ایک ادبی بحث

کچھ عرصہ ہوا جناب دردؔ شاہجہانپوری نے اپنی حسب ذیل غزل اشاعت کے لئے میرے پاس بھیجی:-

اُف کہ بربادیِ دل جی سے بھلاتے ہی بنی
پھر تری انجمنِ ناز میں آتے ہی بنی

یاد اب تک ہے وہ نیرنگِ جنوں کا عالم
ہر قدم پر سرِ پرجوش جھکاتے ہی بنی

ہائے اس چشمِ ندامت کے وہ خاموش گلے
شکوۂ جور و ستم دل سے بھلاتے ہی بنی

توبہ تھرا اُٹھی جب سامنے ساقی آیا
بادہ پیتے ہی بنی جام اُٹھاتے ہی بنی

رحم کر رحم نہ چھیڑ اب دلِ مغموم کا ذکر
اُف وہ بستی جسے ویرانہ بناتے ہی بنی

آگیا فرق یہ کیوں آج تری فطرت میں
وقتِ حیرت تجھے کیوں سامنے آتے ہی بنی

چیخ اُٹھے، جب غمِ کونین سے دونوں عالم
کچھ سمجھ کر ہمیں یہ بار اُٹھاتے ہی بنی

ہائے مجبوریِ دل یاد کوئی جب آیا
نالہ کرتے ہی بنی اشک بہاتے ہی بنی

پردۂ گل سے کیا کس نے تقاضائے نظر
دھجیاں جیب و گریباں کی اُڑاتے ہی بنی

یاد جب آئی وہ کھوئی ہوئی دنیائے قفس
آگ گھبرا کے نشیمن کو لگاتے ہی بنی

ہر خلش میں تھا کچھ اس رنگ کا اے دردؔ سکوں
آرزومندِ ستم دل کو بناتے ہی بنی

میں نے ان کو جواب میں لکھا کہ غزل خوب ہے لیکن ردیف کا اقتضاء یہ ہے کہ مفعول ہر جگہ مؤنث ہو

اور آپ نے مونث و مذکر دونوں اس ردیف کے ساتھ استعمال کئے ہیں اس لئے مطلع کیجئے کہ اساتذہ کا طرزِ عمل کیا رہا ہے۔

دردؔ صاحب نے جواب میں داغؔ کی ایک غزل لکھ کر بھیجی جس میں واقعی تذکیر و تانیث کی کوئی تفریق نہ تھی، میں نے پھر لکھا کہ دلؔ صاحب سے دریافت کیجئے کہ اساتذۂ لکھنؤ نے اس کی پابندی کی ہے یا نہیں۔ اس کا جواب دردؔ صاحب کی طرف سے یہ ملا:-

محترمی -

سلام مسنون - تاخیرِ جواب کا باعث میری علالت تھی جناب کا استفسار قبلہ دلؔ صاحب کی خدمت میں پیش کیا تھا وہ فرماتے ہیں کہ "مصدر کی علامت یائے معروف سے بدلکر فصحائے دہلی بولتے ہیں اور مصدر کو بجائے فعل استعمال کرتے ہیں جیسے مٹھائی کھانی تھی لیکن فصحائے لکھنؤ کہتے ہیں کہ مصدر - اسم مذکر ہے اور کوئی اسمِ مذکر یائے تانیث کی تصریف قبول نہیں کرتا اس لئے مٹھائی کھانا لکھنا چاہئے لیکن فصحائے لکھنؤ کے کلام میں اکثر مثالیں اس کلیہ کے خلاف ملتی ہیں۔

ناسخؔ - اگر دہلیز چھونے کی تجھے تعزیر دینی تھی　　ہمارے ہاتھ بندھوا اپنے دروازے کے بازو سے

اثیرؔ - آنکھ اس کو کھولنی بھی دشوار ہو گئی ہے　　چلئے چمن میں نرگس بیمار ہو گئی ہے

جلالؔ - جب اُٹھ کے جاتے کہ دم توڑتے دمِ نزع　　جو ہونی تھی وہ تمہارے ہی روبرو ہوتی

حضرت داغؔ کا یہ شعر

ذلتِ عشق ہے وہاں عزت　　شکوۂ آبرو کئے نہ بنی

یہاں نہ بنی کے ساتھ بات مقدر مانی جا سکتی ہے مگر

"جب رکا خون بن گئی دم پر　　چاکِ دل کو رفو کئے نہ بنی"

میں مصرعۂ اولیٰ کے ساتھ کوئی لفظ مقدر نہیں سمجھا جا سکتا - میری رائے میں یہ مسئلہ زبان سے متعلق ہے اور زبان کے لئے کوئی قاعدہ نہیں - تاہم میں حضرت نیازؔ کی قابلانہ رائے کو اپنی رائے پر ترجیح دیتا ہوں - "معلوم کر کے مجھے بھی بتانا" امید ہے کہ جناب رائے عالی سے سرفراز فرمائیں گے -

میں نے اپنے پچھلے خط میں جناب سے دریافت کیا تھا کہ آپ موجودہ شعرا میں سب سے زیادہ کس کو پسند فرماتے ہیں غالباً گرامی نامہ تحریر فرماتے وقت آپ کو اس استفسار کا خیال نہیں رہا میں اعادہ کرتا ہوں تغزل میں تنوعِ خیال سے کیا مقصود ہے ہندی شاعری اس نقطۂ نظر سے اُردو شاعری سے بہتر ہے یا کمزور۔ مسائل ذیل کو تغزل سے کیا تعلق ہے اور اگر نہیں ہے تو مستند شعرا کے کلام میں اس قسم کے اشعار کیوں ملتے ہیں۔

جبر و اختیار۔ بے ثباتی دنیا۔ انسان اور اس کی حقیقت۔ شکوۂ فلک۔ شکوۂ بے مہریِ زمانہ۔ مے و مینا۔

حافظ کا دیوان اس قسم کے مسائل سے بھرا پڑا ہے مولانا شبلی "حیات حافظ" میں ان کو تنوعِ خیال کی مثالوں میں درج کرتے ہیں۔ اُردو شاعری میں بھی متقدمین سے لیکر متاخرین تک سب ہی اس پرکار بند نظر آتے ہیں برخلاف اس کے ہندی غزل میں یہ مسائل دیکھنے میں نہیں آتے۔

مجھ پر جناب کی بڑی نوازش ہوگی اگر شرح و بسط کے ساتھ اس استفسار پر روشنی ڈالیں۔

نیاز کیش

درد

(نگار) اس خط کے پڑھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر ضرور پہونچا کہ اس محل پر اہل دہلی و اہل لکھنؤ دونوں نے تذکیر و تانیث کے اختلاف سے اعتنا نہیں کیا ہے، لیکن مجھے اطمینان ابھی تک نہیں ہو سکا ہے اور اسلئے میں اساتذۂ فن سے اپیل کرتا ہوں کہ اس باب میں وہ اپنی رائے سے مستفید فرمائیں۔

درد صاحب کے دیگر استفسارات کا جواب درج ذیل ہے:۔

(۱) موجودہ غزلگو شعرا میں، حسرت موہانی سے زیادہ میں کسی کو پسند نہیں کرتا۔

(۲) تغزل میں تنوعِ خیال کا تعلق صرف انھیں جذبات سے ہونا چاہئے جو عشق و محبت کی دنیا کے لئے مخصوص ہیں اور یقیناً ہندی شاعری اس لحاظ سے زیادہ دلکش ہے اُردو شعرا نے فلسفہ و تصوف وغیرہ

خدا جانے کیا کیا شامل کرکے غزل کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔

جبر و اختیار، شکوۂ زمانہ، بے ثباتی دنیا وغیرہ سب کی غزل میں کھپت ہو سکتی ہے، بشرطیکہ دائرۂ سخن وہی عشق و محبت ہو اور اس کی پوری پابندی اگر کسی نے کی ہے تو وہ صرف سعدی ہے۔ حافظ کا ذوق صرف رندانہ غزل گوئی ہے اور ایک بدمست رند جوش و ولولہ میں سبھی کچھ کہہ جاتا ہے، لیکن اس کو معیاری تغزل نہیں کہہ سکتے۔

اُردو فارسی شاعری کا فرق اس باب میں یہ ہے کہ فارسی زبان کی شیرینی و وسعت ہر مسئلہ کو کسی نہ کسی طرح کھینچکر عشق و محبت سے ملا سکتی ہے اور اُردو میں اس کی گنجایش نہیں۔

بہار

مولفۂ الیاس احمد ایم - اے - ایل - ایل - بی - منصف سہارنپور

"گلدستۂ بہار" فارسی اور اُردو شعرا کے چوٹی کے کلام کا بہترین اور نایاب مجموعہ ہے۔ اس گلدستہ کے ہوتے ہوئے کسی کے دیوان کی ضرورت نہیں ہے چیدہ چیدہ متحد المضامین اشعار ایک خاص سرخی کے تحت میں درج ہیں سرخیاں سیکڑوں ہیں۔ علم و ادب میں گلدستۂ بہار ایک دلکش اور دلفریب اضافہ ہے۔ کتاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے مصرع شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ اہل ذوق بلاحظہ فرمائیں۔ ضخامت ۲۳۶ صفحے۔ قیمت معہ محصولڈاک عہ

ملنے کا پتہ :— **نیجر صاحب دار المصنفین اعظم گڈھ**

تذکرۂ معرکۂ سخن شائع ہوگیا

یہ تذکرہ اردو زبان میں اپنی نوعیت کا بالکل پہلا تذکرہ ہے جس میں زمانۂ قدیم سے لیکر موجودہ عہد تک کے تمام مشہور شعرا، فارسی و اُردو (مثلاً آتش، آرزو، آزاد بلگرامی، احسن مارہروی، اصغر گونڈوی، ڈاکٹر اقبال، امیر، انیس، بیخود، جگر، حزین، خواجہ کرمانی، دبیر، ریاض، سودا، شرر، صائب، صفی، عالی شیرازی، عزیز لکھنوی، غالب، میر، و ناسخ وغیرہ وغیرہ) کے کلام پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں معہ جواب و محاکمہ یکجا کر دئے گئے ہیں فن شعر و انشا کے شایقین کے لئے عجب چیز ہے۔ قیمت معہ محصول ع۸ر

منیجر نگار لکھنو

نور و نار

گزارش :-

پیاری مرے خلوص بھرے آنسوؤں کا نور
میرے جنوں کا راگ، مرے عشق کا سرور
پہونچا ہے دور کے کسی روشن دیار میں
حسنِ ازل کے دائمی فردوس زار میں
جس سرزمیں کو زہرہ و ناہید ہیں رواں
جا کر جہاں ٹھہرتے ہیں تاروں کے کارواں
اُس سرزمیں سے آئی ہے تو میرے دیس میں
موسیقیوں کی روح ہے عورت کے بھیس میں
آئی ہے تا کہ ٹھہرے یہاں رات کے لئے
میرے غریب دل کی مدارات کے لئے
گو تو ہے ایک پیکرِ محسوس جانِ من
آنکھیں ہیں تیرے حسن سے مانوس جانِ من
لیکن ترا وجود طلسمِ خیال ہے
تخلیق رنگ و نور کی حدِ کمال ہے
آنکھیں تری بنی ہیں فرشتوں کے زہد سے

اے کہکشاں سے اُتری ہوئی پاک نازنیں
ہیں تیرے انتظار میں اُس دیس کے مکیں
جا میرے غمکدے میں نہیں کچھ بجز الم
ہے میری کائنات محبت کا تلخ غم
جا اپنے رنگ و نور سے معمور گھر میں جا
اس غمکدے سے دور "مسرت نگر" میں جا

جواب :-

اے اُلفت و نیاز کے پابند نوجوان
بہتر ہے ارضِ نور سے یہ تیرا خاکداں

میرے وطن میں عشرتِ جاوید ہے مکیں	بے شک جمالِ زہرہ و ناہید ہے مکیں
میرے وطن میں نور کے چشمے بھی ہیں رواں

بے فائدہ نگردہ "بیابانِ نور" ہے	اُس نور زار میں مرا دل غم سے چور ہے
اُکتا گئی ہوں نور سے ہے نار کی تلاش	جذباتِ آتشیں کے تپش زار کی تلاش
تیری جنوں نواز نگاہیں عجیب ہیں،	ڈوبی ہوئی گداز میں آہیں عجیب ہیں
آئی ہوں تیری چاہ میں میں کتنی دور سے	برباد کر نہ مجھ کو عبث ذکرِ نور سے

آغوشِ اشتیاق میں اس طرح لے مجھے
بس اپنے دل کی آگ سے تو پھونک دے مجھے

عدم

مجموعۂ استفسار و جواب

کے مضامین کی فہرست آپ کو اس رسالہ کے اخیر میں ملیگی اس کو ملاحظہ فرماکر فیصلہ کیجئے کہ آیا ایسا نادر ذخیرۂ معلومات جو ۵۱۲ صفحات کو محیط ہے ہے کہیں گراں کہا جا سکتا ہے۔ آپ نے اگر اسوقت اس کو نہیں دیکھا تو اب طلب فرمائیے اور اپنے احباب کو بھی متوجہ کیجئے۔ منیجر نگار لکھنؤ

جمالستان

نیاز فتحپوری کے ۳۲ ادبی شاہکار اور افسانے جو اسی سال شائع ہوئے ہیں، اور ۵۰۰ صفحات پر محیط ہیں۔ پہلے اڈیشن کی جلدیں بہت کم رہگئی ہیں۔ اگر آپ نے اسوقت تک اپنی لائبریری کے لئے طلب نہیں فرمایا تو اب سہی۔ قیمت مجلد للعہ غیر مجلد للعہ علاوہ محصول۔ منیجر نگار

محشرستان

حضرت محشر عابدی کے ان مختصر افسانوں کا مجموعہ جو مختلف رسائل میں شائع ہو کر پبلک سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ قیمت مجلد عہ غیر مجلد عہ علاوہ محصول منیجر نگار لکھنؤ

فراق

مگر مجھے تری قسم
ہنوز تجھسے دور ہوں

مرے نیاز عشق سے بسا ہے آستاں ترا
مری شمیم شوق سے کھلا ہے گلستاں ترا
ہراک خواب ہے مرا اگرچہ رازداں ترا

جنوں فشانیاں مری
ترے قریب ہیں بہت
بہت کہانیاں مری
تجھے حبیب ہیں بہت

مگر مجھے تری قسم ہنوز تجھسے دور ہوں

اگرچہ جذب عشق سے
جہاں ہے تو وہاں ہوں میں
نہاں ہوں کائنات سے
ترے لئے عیاں ہوں میں
تو نور ہے میں طور ہوں
تو راز ہے بیاں ہوں میں

مری طواف گاہ ہے ہر ایک رہگذر تری
وہیں گیا ہے دل مرا جہاں گئی نظر تری

مگر مجھے تری قسم
ہنوز تجھسے دور ہوں

حدود کا نشاں ہو کیوں
سجودگاہِ عام ــــ میں
مغائرت کا ذکر کیا
حدیقۃ السلام میں
کچھ امتیازِ "ما و تو"
نہیں ہے اس نظام میں

حریم نازِ دوست میں کچھ احتساب ہی نہیں
جہاں حبیب ہے وہاں کوئی حجاب ہی نہیں

مگر مجھے تری قسم
ہنوز تجھسے دور ہوں

تصورات کے خدا
تصورات میں ہے تو!
تخیلات کی دعا
تخیلات میں ہے تو!
مری حیات تجھسے ہے
مری حیات میں ہے تو

مرے ہراک خواب میں ترا خیال ہی تو ہے
مرے ہراک خیال میں ترا وصال ہی تو ہے

مگر مجھے تری قسم
ہنوز تجھسے دور ہوں

روش صدیقی

فردوسِ خیال

آسماں رات کو تاروں سے بھرا ہوتا ہے ہاں جب ایسے میں کوئی نغمہ سرا ہوتا ہے
میں کسی دوسری دنیا میں چلا جاتا ہوں

چاندنی رات میں جب مست ہوا چلتی ہو جیسے پنکھا کوئی مخمور پری جھلتی ہے
میں کسی دوسری دُنیا میں چلا جاتا ہوں

گرمیوں کی شب پُرکیف کے سناٹے میں گلفروشوں کی جب آتی ہیں حسیں آوازیں
میں کسی دوسری دنیا میں چلا جاتا ہوں

فصلِ باراں میں جب آتی ہو گھٹا گھر گھر کے اور جذبات اُبھرتے ہیں دلِ کافر کے
میں کسی دوسری دنیا میں چلا جاتا ہوں

جب گلی میں کوئی درویش صدا کرتا ہے خوش رہو، میرے میاں! اسائیں دُعا کرتا ہے
میں کسی دوسری دنیا میں چلا جاتا ہوں

راہ میں جب کوئی دوشیزہ نظر آتی ہے اور بوزلف کی چلتے میں سُنگھا جاتی ہے
میں کسی دوسری دُنیا میں چلا جاتا ہوں

کوئی کہتا ہے جب افسانۂ حُسن و اُلفت کھولتا ہے درِ میخانۂ حُسن و الفت
میں کسی دوسری دنیا میں چلا جاتا ہوں

یاد جب آتے ہیں عیش و غمِ اُلفت کے دن ہائے وہ عشق کی پُرلطف اذیت کے دن
میں کسی دوسری دنیا میں چلا جاتا ہوں

دل کے ارمان ہوا کرتے ہیں جب زیرِ غور دل تو جذبات کی شدت سے دھڑکتا ہے اور
میں کسی دوسری دُنیا میں چلا جاتا ہوں

اختر انصاری

اعتراف شکست

مجھے اعترافِ شکست ہے
نہ خدا کے واسطے چھیڑ اب

نہ حریف لذت غم ہوا
نہ خموش رہ کے جفا سہی
نہ رہین درد و الم ہوا
نہ ستم سہے، نہ بلا سہی
نہ وفا کا پاس کیا ذرا
نہ ملامت رفقا سہی
یہی ننگ عشق میں کم ہو کیا؟
یہ ادائے لطف و کرم ہو کیا؟
یہ جدید طرزِ ستم ہو کیا؟
نہ خدا کے واسطے چھیڑ اب
مجھے اعتراف شکست ہے

تری ہر نگاہ بلا اثر
مرے دل پہ اب بھی ہو حکمراں
تری ہر ادائے جمیل کا
نہ دل سے اب بھی ہوں قدرداں
ترا ہر تبسم دلربا
مرے واسطے ابھی ہو جانستاں
گرا سے جیلئے ذ تحو بر ر
نہ وہ میں ہوں اور نہ وہ آرزو
نہ وہ شوق ہے، نہ وہ جستجو
نہ خدا کے واسطے چھیڑ اب
مجھے اعتراف شکست ہے

یحییٰ نقوی

ترکی جمہوریہ
انقلاب ترکی کی بے مثل تاریخ۔ ایک زندہ قوم کی جد و جہد کی سبق آموز داستان
مصنفہ ضمیر احمد ہاشمی۔ ایم۔ اے۔ قیمت عہ علاوہ محصول۔ منیجر نگار لکھنؤ

عورت سے خطاب

ایک مشتِ خاک کو جب مل گیا حُسن و شباب ساغرِ گل میں نظر آئی محبت کی شراب
نور کے سانچے میں ڈھل کر آئی تصویرِ بہار اب نظر آنے لگی آغوشِ آدم کامگار
اے کمالِ صنفِ نازک اے محبت کی پری تیرے جلوے عیش پرور، تو ہے جنت کی پری
تو بہشتی حور تھی، اب باوفا عورت بنی روح کی پاکیزگی سے پیکرِ عصمت بنی
آسمانِ آرزو کا تو کوئی سیارہ ہے تو شہابِ حُسن ہے، یا دلربا مہ پارہ ہے
تیری آمد سے ہوا قائم محبت کا نظام ورنہ رہ جاتی یونہی تکوینِ عالم ناتمام
تو دلوں کے واسطے لائی ہے صہبائے حیات موجزن تیرے اشاروں پر ہے دریائے حیات
تیری آنکھوں سے عیاں ہے ایک طوفانِ شباب شعلۂ سینا ہے تجھ میں، تو ہے جنت کا جواب
تیرے جلووں کی نمائش منظرِ جوشِ جمال معجزہ قدرت کا، ترکیبِ عناصر کا کمال
تو وہ قوت ہے نہیں جسکی ہے کوئی انتہا تو ہے ایسی انتہا، جس کی نہیں ہے ابتدا
کہربائی قوتوں سے کام جب لیتی ہے تو سنگدل کو مسکرا کر موم کر دیتی ہے تو
شعر و موسیقی کے نغمے ہیں تری آواز میں اک جہانِ دلکشی ہے تیرے ہر انداز میں
مرد کی مونس ہے تو اور ہمدم و دمساز ہے اور تکوینِ جہاں کا تو مقدس راز ہے
عیش کی تصویر تو ہے ردِ کلفت کے لئے ہے محبت تیرے دم سے، تو محبت کے لئے

آسمانِ عشق کا تو خوشنما مہتاب ہے
تو سراپا ذوقِ انسانی کا دلکش خواب ہے

فطرت واسطی

بمبئی کے ساحل پر

کارواں در کارواں رنگینیاں — میکدہ در میکدہ کیفِ شراب
حُسن کی رعنائیوں کا ازدہام — چاندنی کی نزہتیں زیرِ نقاب
جلوۂ فطرت کی لالہ کاریاں — شاہدِ معنی کا شیریں پیچ و تاب
ہلکی ہلکی وہ گلابی ساریاں! — ریشمی زرتار پلّو برقِ تاب
وہ شلوکے جامدانی، نیلگوں! — اُن سے وہ چھنتا ہوا رنگِ شباب!
وہ نگاہیں وہ تڑپتی بجلیاں! — اور وہ شاداب چہرہ وہ شباب!
ہلکا ہلکا سا تبسم زیرِ لب — حُسن کی گستاخیاں وہ بے حجاب!
قامتِ نازک میں ہلکی سی لچک — نرم رو موجوں میں جیسے پیچ و تاب
وہ تمناؤں کے پیکرِ دلنواز! — "زندگی ہے یا سکون آمیز خواب"

شام کی رنگینیاں ہیں بیشمار — چھپ رہا ہے رفتہ رفتہ آفتاب
حُسن و اُلفت کا اعادہ ہو چکا — مانگ لے کچھ اے دلِ حسرت مآب

بمبئی کے ساحلوں کو اے شمیم
اک نظر ہی دیکھ لینا ہے ثواب

شمیم نعمانی نیازی

انقلاب

چل چکا ہے خوابِ ہستی پر فسونِ انقلاب
"خود فراموشی" بدلکر "خود نما" ہو جائیگی

بڑھ رہا ہے شعلۂ مغرب بداماں صد خروش
آتشیں بادِ مخالف جانفزا ہو جائیگی

ڈالدی جائیگی پائے غم میں زنجیرِ شکست
مشکلِ حالات خود "مشکلکشا" ہو جائیگی

روند ڈالا جائیگا اقبالِ ظلمت پاؤں سے
"تیرگی" مٹ کر "جہاندار ضیا" ہو جائیگی

سر کو ٹکرائیگا دیواروں سے "دورِ انحطاط"
چارسو شانِ ترقی رونما ہو جائیگی!

ٹوٹ جائیگا جہادِ قومیت کا سلسلہ
روحِ مذہب - دیکھنا بے آسرا ہو جائیگی

ٹھوکریں کھائیگا پھر سرمایہ دارِ حیلہ گر
حکمرانی زہر ــ دولت "سنکھیا" ہو جائیگی

زندگی کی کشمکش سے ہوگی تکمیلِ وجود
"شامِ غربت" صبحِ عیشِ جانفزا ہو جائیگی!

خود بخود فطرت پہ تب گویا شباب آجائیگا
کروٹیں لیتا ہوا پھر "انقلاب" آجائیگا

اختلاطِ مشرق و مغرب میں وقفہ تابکے
دیکھنا اُڑ جائیگی مذہب پرستی ایکدن

حورِ جنت اور انساں کے تقدس کا خیال
لوگ سمجھیں گے اسے ظلمت پرستی ایکدن

عقل پست و فہم پست، انسانکا سوز و ساز پست
دولتِ اسلاف ہو جائیگی سستی ایکدن؟

برق کی ہلکی سی رو اسکو جلا دیگی کبھی
یا سراپا برق بن جائیگی ہستی ایکدن

ہے اسیدم جستجوئے "تازہ ویرانی" مجھے
عرش کے تارے دکھادے میری حیرانی مجھے

شمیم نعمانی نیازی

جنوری سنہ ۳۵ء کیلئے

حسب ذیل عنوانات پر مقالے درکار ہیں

(۱) دہلی اور لکھنؤ اسکول کی شاعری پر مورخانہ نظر اور انکی خصوصیات

(۲) دونوں اسکولوں کے اکابر اور ان کا فرق مدارج

(۳) فن اور زبان کی حیثیت سے دونوں کا مرتبہ

(۴) لکھنؤ اسکول پر دہلی کا اثر

(۵) دہلی اسکول پر لکھنؤ کا اثر

(۶) دونوں اسکولوں کی غزلگوئی پر تفصیلی تبصرہ

(۷) لکھنؤ اسکول کے تین بہترین شاعروں کے ۲۰،۲۰ شعر

(۸) دہلی اسکول کے تین بہترین شاعروں کے ۲۰،۲۰ شعر

(۹) منظوم افسانے یا مثنوی لکھنؤ اسکول میں

(۱۰) منظوم افسانے یا مثنوی دہلی اسکول میں

(۱۱) دکن اور اُردو شاعری (اسوقت تک تمام ادوار پر تبصرہ)

(۱۲) پنجاب اور اُردو شاعری (اسوقت تک تمام ادوار پر تبصرہ)

(۱۳) تذکرہ نگاری کی حیثیت سے لکھنؤ اور دہلی کی خدمات

(۱۴) دونوں اسکولوں کے کارنامے رباعیات، مرثیہ، قصیدہ و نعت میں

(۱۵) دولت مغلیہ کے انحطاط کا اثر دہلی کی شاعری پر

(۱۶) شاہان اودھ اور لکھنوی شاعری

(۱۷) دہلی اور لکھنوی شاعری میں اخلاقی و مذہبی عنصر

(۱۸) شاعری کے لحاظ سے لکھنؤ کا دور زریں

(۱۹) شاعری کے لحاظ سے دہلی کا دور زریں

(۲۰) لکھنؤ اسکول کا سب سے پہلا شاعر جس نے دہلی کا تتبع کیا

(۲۱) دہلی اسکول کا سب سے پہلا شاعر جس نے لکھنؤ کا تتبع کیا

(۲۲) لکھنؤ اور دہلی کے وہ شعراء جنھوں نے ملک و قوم کو کوئی خاص پیغام پہنچایا

(۲۳) کیا دہلی اسکول روبہ انحطاط ہے؟ اور کیوں

(۲۴) کیا لکھنؤ اسکول روبہ انحطاط ہے؟ اور کیوں

(۲۵) رامپور کا تعلق دہلی اور لکھنؤ اسکولوں سے

(۲۶) حیدرآباد اور لکھنؤ و دہلی اسکول کا اس سے تعلق

(۲۷) کیا لکھنؤ اسکول نے کلکتہ میں بھی شاعری کو متاثر کیا؟

(۲۸) کیا لکھنؤ اسکول میں اصلاح کی ضرورت ہے؟ اگر ہے تو کیا

(۲۹) کیا دہلی اسکول میں اصلاح کی ضرورت ہے؟ اگر ہے تو کیا

(۳۰) مستقبل میں آپ کو اُردو شاعری سے کیا توقعات ہیں؟

(۳۱) دونوں اسکولوں کے وہ شعراء جنھوں نے قدامت کو ترک کر کے کسی ابداع و اختراع سے کام لیا

(۳۲) لکھنؤ اور دہلی کے ریختی اور ہزل گو

(۳۳) لکھنؤ اور دہلی کی خواتین جنھوں نے شاعری میں نمایاں حصہ لیا۔

(۳۴) لکھنؤ اسکول کے مختلف ادوار اور ہر دور کے بہترین شاعر

(۳۵) دہلی اسکول کے مختلف ادوار اور ہر دور کے بہترین شاعر

(۳۶) آگرہ اور دہلی کا شاعرانہ تعلق

نوٹ:۔ لکھنؤ اور دہلی کی شاعری سے مراد وہ تمام شعراء ہیں جو یہاں کی شاعری سے متاثر ہو کر اسی رنگ میں شعر کہتے ہیں۔ اس کے لئے کسی خاص جگہ کا باشندہ ہونے کی شرط نہیں ہے۔

فہرست مضامین مجموعۂ استفسار و جواب

(۱) غوازی مصر حشیشیون - اخوان الصفا (۲) گریۂ جنین (۳) قمری مہینے (۴) بوہرہ (۵) اصطلاحات
تصوف کا ترجمہ (۶) ابوالعلاء المعری (۷) عبداللہ پاشا فکری (۸) نورجہاں کا ایک شعر (۹) فن کاغذ سازی (۱۰) عرب کا
بازار بردہ فروشی (۱۱) نظام شمسی کا آفتاب (۱۲) اقسام عالم جبر و اختیار (۱۳) ہلالی پرچم (۱۴) سورج کا وقت طلوع
وغروب بڑا نظر آنا اور کم گرم ہونا (۱۵) بالشویزم (۱۶) باب و بہار (۱۷) نباتات کا تنفس (۱۸) جراحی اور مسلمان (۱۹) خواب
کی حقیقت اور تعویذ وغیرہ (۲۰) لفظ ”در“ کا بالتشدید استعمال (۲۱) دستوریت (۲۲) بندوق - بارود - محکمۂ آبکاری (۲۳)
بحر مردہ (۲۴) نامہ بر کبوتر (۲۵) یورپ کی وسیع ترین زبان (۲۶) سعد بن وقاص کا مزار (۲۷) سعادو نحلہ و طبیعیات
کے زاویۂ نگاہ سے (۲۸) اجراء اخبارات کی تاریخ (۲۹) عالم خیال اور رشک و رقابت (۳۰) خواتین ترکی اور تعلیم
(۳۱) نیستی سے ہستی کا امکان، درس نظامی کی تاریخ (۳۲) طبقۂ نسواں اور غزل گوئی (۳۳) برج بابل (۳۴) طبقۂ
فاسسٹ کی وجہ تسمیہ (۳۵) آفتاب کے داغ (۳۶) سامری کون تھا (۳۷) کیا بدوح خدا کا نام ہے (۳۸) نوٹ
کے اجراء کا فائدہ (۳۹) مئی کے پستہ قد محسوس ہونے کا سبب (۴۰) چند الفاظ کی تحقیق (۴۱) باغ ارم کی حقیقت (۴۲)
فلسفۂ محبت (۴۳) متنبی کی وجہ تسمیہ (۴۴) سیم تلغراف (۴۵) میقات حج (۴۶) بندقیہ کی حقیقت (۴۷) طبقۂ متاولہ (۴۸)
اصحاب کہف (۴۹) بھوت پریت (۵۰) فلسفۂ اجتماع (۵۱) جان بل (۵۲) کس کا شعر ہے (۵۳) سالِ کبیسہ حساب
گرگوری میں (۵۴) انڈیا آفس لائبریری (۵۵) سالوشین آرمی (۵۶) ہالہ کا سبب (۵۷) عین الزماں طرابلسی (۵۸)
تطابق سنہ ہجری و عیسوی (۵۹) کرامات غوث الاعظم (۶۰) حافظ شیرازی اور تیمور کی ملاقات (۶۱) چند الفاظ کے
معنی (۶۲) طاعت و جزا کی تمنا (۶۳) داغ و امیر (۶۴) الپ ارسلان (۶۵) معجزہ و کرامات سے انکار (۶۶)
صدور محال کا امکان (۶۷) پردہ اور تعلیم نسواں (۶۸) مریخ کی حقیقت (۶۹) ایران کا صفوی خاندان اور
قاجاری حکومت (۷۰) منصور حلاج (۷۱) آنکھ اور چال کی تشبیہ (۷۲) معجزہ و کرامات (۷۳) آنسہ مئی کا شعر منثور (۷۴)

گریۂ معصوم (۷۵) چند اصطلاحات کا ترجمہ (۷۶) ابوالعتاہیہ کے متعلق چند سوالات (۷۷) فرقۂ معتزلہ کے مختلف
فرقے (۷۸) ایک برہم مستفسر کے چند استفسارات (۷۹) کھدر، جن، تعویذ، اُردو لغت (۸۰) بت غالیہ مو (۸۱) اسمائے نجوم
(۸۲) بروج اسمار کی حقیقت (۸۳) انسان مجبور ہے یا مختار (۸۴) ہسپانیہ و اُندلس (۸۵) حکومت مصر (۸۶) اسماعیلیہ
مذہب (۸۷) اعداد متحابہ (۸۸) ادبیات (۸۹) ستاروں کی تعداد (۹۰) بوقلموں (۹۱) کلام مسجع (۹۲) علی محمد باب (۹۳)
مذہب و عقل (۹۴) طوفان نوح (۹۵) دیباچہ کی اصلیت (۹۶) رامائن و مہابھارت (۹۷) ابدالی اور درانی (۹۸)
قلعۂ گوالیار (۹۹) سید جلال (۱۰۰) خلفاء عباسیہ مصر (۱۰۱) ہنولا اور اجرام فلکی (۱۰۲) مرزا عبدالقادر بیدل (۱۰۳)
نخ فروش نیشاپور (۱۰۴) تشبیہات چشم (۱۰۵) عرب میں گودنے کا رواج (۱۰۶) دیبل کی جائے وقوع (۱۰۷) طبقۂ نسوال
اور تعلیم (۱۰۸) چند اصطلاحات کا ترجمہ (۱۰۹) شاعری کی بعض اصطلاحیں (۱۱۰) عربی میں تقسیم علوم (۱۱۱) حقیقت و
مجاز (۱۱۲) عالم یقین و عالم جبروت (۱۱۳) چند اصطلاحات شاعری (۱۱۴) صلوات الوسطیٰ (۱۱۵) ظفر کا غیر مطبوعہ کلام۔
(۱۱۶) اوزون فردوسی (۱۱۷) تاناشاہ (۱۱۸) تھیاسوفکل سوسائٹی (۱۱۹) گچی چری (۱۲۰) فیروزہ حصار (۱۲۱) برہمو سماج
(۱۲۲) مستناپور (۱۲۳) اڑھائی دن کا جھونپڑا (۱۲۴) مثنوی مولانا روم کا ایک شعر (۱۲۵) پرانا قلعہ داتا گنج لاہوری (۱۲۶)
تغزل اور اصطلاح صوفیہ (۱۲۷) منصور حلاج اور شغر قابی فرعون (۱۲۸) بعض الفاظ کے معنے (۱۲۹) کس کا شعر ہے۔
(۱۳۰) لیکاڈس و کیخسرو (۱۳۱) ملا دوپیازہ کی قبر (۱۳۲) میر شیر علی افسوس (۱۳۳) کیا زیب النساء کے شعر ہیں (۱۳۴)
فری میسن کیا ہے (۱۳۵) الف لیلہ (۱۳۶) شیخ بدر عالم شیخ بایزید (۱۳۷) زبان اُردو کی ابتداء، سہرا (۱۳۸) عشق محبت
(۱۳۹) دوسرے کروں میں آثار حیات (۱۴۰) اسلام کے متفرق فرقے اور فرقۂ اعتزال (۱۴۱) اکل سام (۱۴۲) استعارے
کی شاعری (۱۴۳) امیر دوست محمد خاں (۱۴۴) حافظ کے دو شعر (۱۴۵) ہم اسد اللّٰہم وہم اسد اللّٰہیم (۱۴۶) فرقۂ اسماعیلیہ
(۱۴۷) ابن رشد و شیخ الرئیس (۱۴۸) ابوالفضل کی قبر اور غالب کا ایک شعر (۱۴۹) عرفی اور شاہزادہ سلیم (۱۵۰) زحل اور انوس
ہنتون (۱۵۱) عمر انسانی (۱۵۲) نسبتی تھانیسری (۱۵۳) عہد اسلام کے سکے (۱۵۴) سرطان (۱۵۵) ملکۂ چین (۱۵۶)
سورۂ فاتحہ (۱۵۷) ہالہ اور مد و جزر (۱۵۸) مونٹ کارلو (۱۵۹) حالی کا ایک شعر (۱۶۰) نظریۂ تکہرب (۱۶۱) انسولین۔
(۱۶۲) ارتقائے انسانی کی دوسری منزل (۱۶۳) قصر الحمراء (۱۶۴) بعض اصطلاحات کا ترجمہ (۱۶۵) ارسطو کا مدفن
(۱۶۶) یاجوج ماجوج (۱۶۷) مثنوی کا ایک شعر (۱۶۸) ہندی اور عربی شاعری (۱۶۹) نیو پلوٹنزم (۱۷۰) بیدل کے
بعض اشعار (۱۷۱) مثنوی کا ایک شعر (۱۷۲) اپریل فول (۱۷۳) مشتری (۱۷۴) امریکہ کی دولت۔